تکلف برطرف

مجتبیٰ حسین

تکلف برطرف

مزاحیہ مضامین
کا
مجموعہ

مجتبیٰ حسین

ناشر
حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد

بار اول فروری ۱۹۶۸ء : ایک ہزار
بار دوم : ایک ہزار
جنوری ۱۹۸۳ء

خوشنویسی : محمد ولی الدین
سرِورق : محمد جعفر آرٹسٹ
طباعت : گولڈن پریس حیدرآباد

★ قیمت : بارہ روپے -/12

ناشر

حُسامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد
فون : ۴۴۳۸۵

اُن "سات برسوں" کے نام ________

جنھوں نے میری شخصیت اور فن کو نکھارا

(مجتبیٰ حسین)

۲۱؍فبروری سنہ ۱۹۶۸ء

ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز

کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

مخدوم

ترتیب

طبع دوم کے موقع پر

"تکلف برطرف" میرے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۸ء میں چھپا تھا۔ تقریباً ۱۲ برسوں سے یہ مجموعہ بازار میں دستیاب نہیں تھا۔ برادرم نصیر احمد مالک حسامی بک ڈپو کا اصرار نہ بڑھتا تو شاید اب بھی یہ ایڈیشن شائع نہ ہوتا۔

عزیز دوست مسیح انجم "تکلف برطرف" کے سوائے میرے ہر مجموعے کی اشاعت سے کسی نہ کسی طرح متعلق رہے ہیں۔ یہ واحد مجموعہ تھا جو مسیح انجم کے تعاون کی زد میں نہ آسکا تھا مگر اب یہ مجموعہ بھی ان کے تعاون سے محفوظ نہ رہ سکا۔ میں اس محبت کے لئے ان کا تہہ دل سے سپاس گزار ہوں۔

عزیز دوست محمود الحسن خاں صوفی کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس ایڈیشن کی اشاعت میں اپنا حصہ ادا کیا۔

۲۹/۸۰، مالویہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷
۱۰ر نومبر ۱۹۸۲ء

مجتبیٰ حسین

مجھ سے ملئے

مجھ سے ملیے ! مجھے مجتبیٰ حسین کہتے ہیں ۔ مجھ سے مل کر آپ کو واقعی خوشی ہوگی یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا لیکن چونکہ آپ رسماً یہ جملہ کہنے کے عادی ہیں کہ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" اسی لئے مجھے یقین ہے کہ آپ کو مجھ سے مل کر خوشی ہی ہوگی۔ کوفت بھی ہوسکتی ہے لیکن آپ کی شرافت آپ سے یہ جملہ نہیں کہلوائے گی ۔

سماجی محفلوں میں برسوں سے "تعارف" کا یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ دو اشخاص جب ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہوتے تو کوئی تیسرا شخص ان دونوں کا تعارف کروادیتا ہے۔ پھر یہ "درمیانی شخص" دونوں اصحاب کے اوصاف حمیدہ وغیر حمیدہ کو یوں بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے کہ پہلی ملاقات میں تو دونوں ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتے ہیں مگر بعد میں زندگی بھر کف افسوس ملتے رہتے ہیں ۔ اور اس طرح مسلسل ملنے سے "کفِ افسوس کی جو حالت ہوتی ہوگی اس کا اندازہ آپ خود لگاسکتے ہیں۔ مگر ایک بات میں نے محسوس کی ہے کہ تعارف کے معاملے میں" درمیانی شخص"

بڑا اہم ہوتا ہے ۔جب تک یہ "درمیانی شخص" پردۂ سیمیں پر جلوہ گر نہیں ہوتا، دو اشخاص ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی "اجنبی" ہی بنے رہتے ہیں۔ اپنے تعارف کے سلسلہ میں بھی مجھے ایسے "درمیانی شخص" کی کمی بے حد محسوس ہو رہی ہے جو میرے اوصافِ حمیدہ کو یوں نمک مرچ لگا کر بیان کرے کہ آپ مجھ سے مل کر واقعی خوش ہو اُٹھیں۔

میری عین خواہش تھی کہ کرشن چندر میری پہلی کتاب کے لئے میرا تعارف لکھیں اور وہ سراپا تکلّف ہوتے ہوئے بھی "تکلّف برطرف" کا دیباچہ لکھنے کے لئے رضامند ہو گئے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے مجھے لکھا تھا کہ "مجھے تمہارا تعارف لکھ کر واقعی خوشی ہوگی، اس لئے کہ تم صحیح معنوں میں مزاح نگار ہو، عمدہ والے اور عمدہ مقصد والے"۔ میں کرشن چندر کا حد درجہ احترام کرتا ہوں اور سچ پوچھئے تو کرشن چندر نے ہی مجھے اپنے مضامین کا مجموعہ شائع کرنے کے لئے اُکسایا تھا۔ مگر میری بدقسمتی کو کیا کیجئے کہ ۲۳ر نومبر ۱۹۶۷ء کو جب کرشن چندر نے میرا تعارف لکھنے کی کوشش کی تو عین اسی دن ان کے قلب پر حملہ ہوا۔ جب مجھے اس کا علم ہوا تو مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے لکھنے پر کرشن چندر پکڑے جائیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جرم میں کروں اور سزا کرشن چندر پائیں۔ اس کے بعد میں نے کرشن چندر کو زحمت دینے کا خطرناک ارادہ ترک کر دیا۔ پھر سوچتا رہا کہ اپنا تعارف کسی ایسے شخص سے لکھواؤں جو مجھے قریب سے جانتا ہو۔ چنانچہ میں نے قریب سے جاننے والوں کی ایک فہرست تیار کی۔

ان میں سے بعض مجھے ایک میل کی دُوری سے جانتے تھے اور بعض ایک فٹ کی قربت سے لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو مجھے اچھی طرح جانتا ہو۔ بڑی تگ و دو اور تلاش و جستجو کے بعد مجھے ایک ایسا شخص نظر آیا جو مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور اتفاق سے یہ شخص میں ہی ہوں۔ اگر میں اپنے تعارف کے سلسلے میں کسی اور "درمیانی شخص" کا وسیلہ ڈھونڈتا تو مجھے یقین تھا کہ یہ شخص مرنے کے بعد دوزخ میں جاتا۔ کیوں کہ یہ شخص یقیناً میری ایسی صفات کا

ذکر کرتا جو مجھ میں قطعاً نہیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ایک جھوٹ ہی ہوتا۔ اور جھوٹے کا دوزخ میں جانا کوئی خلافِ توقع بات نہیں ہے۔ میں چونکہ دوسروں کو ضرر پہنچائے بغیر زندگی گزارنے کا عادی رہا ہوں، اسی لئے اپنا تعارف خود کروا رہا ہوں کہ اگر میں اپنی ذات کے تعلق سے جھوٹ بولوں تو خود ہی دوزخ میں جاؤں اور اپنے کئے کی سزا پاؤں۔

میری زندگی کے دیگر احوال یہ ہیں کہ میں ۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو اس دنیا میں پہلی بار پیدا ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک مسلسل زندہ ہوں اور اندیشہ ہے کہ آئندہ بھی کئی برسوں تک زندہ رہوں گا۔ اپنی تعلیم کے بارے میں یہ عرض کردوں کہ پرائمری اسکول میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا رہا۔ مڈل اسکول میں فٹ بال کھیلتا رہا، ہائی اسکول میں پنگ پانگ اور اسی قسم کے دوسرے کھیلوں میں نام کماتا رہا۔ البتہ کالج میں پہنچ کر اسپورٹس سے میری دلچسپی اس لئے کم ہوئی کہ سینما بینی اور ہوٹلنگ نے مجھے اسپورٹس کی طرف توجہ دینے کی مہلت ہی نہ دی۔ غرض زمانہ طالب علمی میں ہر ایسی سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا جو "خارج از نصاب" ہو۔ مجھے "داخل درنصاب" سرگرمیوں سے ہمیشہ چڑ رہی۔ چنانچہ کالج کے زمانے میں میں نے اپنا ایک ذاتی ٹائم ٹیبل بنا رکھا تھا۔ انگریزی کے گھنٹے میں کالج کی کیفے ٹیریا میں بیٹھتا تھا۔ سماجیات کے گھنٹے میں کلاس روم سے باہر دوستوں سے سماجی تعلقات بڑھانے میں مصروف رہتا تھا۔ معاشیات کے گھنٹے میں دوستوں سے قرض مانگا کرتا تھا اور اُردو کے گھنٹے میں یونیورسٹی کے لینڈ اسکیپ گارڈن میں بیٹھ کر مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ اساتذہ سے میرے بعض خفیہ معاہدات تھے جن کا علم میرے ساتھیوں کو نہیں تھا۔ چونکہ میں کلاس روم میں پٹاخے چھوڑنے، بندروں اور بلیوں کی آوازیں نکالنے میں بڑی مہارت رکھتا تھا، اسی لئے ہر سال اساتذہ مجھ سے خفیہ طور پر معاہدے کرلیتے تھے کہ میں حتی الامکان کلاس روم میں آنے کی کوشش نہ کروں۔ ایسے خفیہ معاہدوں کے باعث میں تو کلاس روم سے باہر رہتا تھا لیکن رجسٹر حاضری میں بلاناغہ موجود رہتا تھا۔ استادوں کی اسی

شفقت اور مہربانی کا نتیجہ تھا کہ کالج سے نکلنے کے بعد میں کئی دن تک عملی زندگی میں اپنے قدم جما نہ سکا۔

اپنی چھوٹی سی زندگی کا نصف حصہ ہوسٹلوں میں گزار چکا ہوں اسی لئے اب اپنے گھر کو بھی "ہوسٹل" ہی کی طرح استعمال کرتا ہوں اور بیوی کو "وارڈن" سمجھتا ہوں۔ رات دیر گئے گھر اس لئے واپس آتا ہوں کہ ہوسٹل میں میری زندگی کا معمول یہی تھا۔ شادی کے بعد میری بیوی راتوں میں بڑی دیر تک میری واپسی کا انتظار کیا کرتی تھی لیکن اب وہ بھی میرے دیر سے گھر واپس آنے کی عادی بن چکی ہے۔ اگر کبھی جلد گھر واپس آتا ہوں تو وہ بے حد پریشان ہو جاتی ہے کہ کہیں میری صحت تو خراب نہیں ہو گئی۔

سنہ ۱۹۵۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی اور سنہ ۱۹۵۸ء میں ڈپلوان پبلک ایڈمنسٹریشن کا امتحان کامیاب کیا۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کو مناسب روزگار نہیں ملتا تو وہ اُردو کا صحافی بن جاتا ہے، سو میں بھی صحافی بن گیا۔ اور حیدرآباد کے مقبول روزنامہ "سیاست" سے وابستہ ہو گیا۔ ابھی اچھی طرح ہوش سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ والدین نے میری شادی کر دی اور یوں میرے رہے سہے ہوش پھر اُڑ گئے اور اب تک اُڑے ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۱ء تک میں نے ایک خاموش صحافی کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ ان دنوں میرا واحد مشغلہ نطشے کا فلسفہ پڑھنا تھا۔ نطشے کے فلسفے سے تو میں بیزار نہ ہوا البتہ زندگی سے بیزار ہو گیا۔ ان ہی دنوں "موت" کے موضوع پر چند کہانیاں لکھیں جنھیں اب اپنی موت کے بعد ہی چھپوانے کا ارادہ ہے۔ جب مجھے پتہ چلا کہ ساری زندگی یوں ہی روتے دھوتے گزرنے والی ہے تو میں نے سوچا کیوں نہ اسے ہنستے کھیلتے گزار دیا جائے۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں میری زندگی میں ایک ایسا خوشگوار موڑ آیا کہ میں نطشے کی بجائے مارک ٹوین اور پی جی وڈہاوس کو پڑھنے لگا۔

مجھ جیسے سنجیدہ آدمی کو خواہ مخواہ مزاح نگار بنانے کی ذمہ داری میرے بڑے بھائی

جناب محبوب حسین جگر اور ایڈیٹر "سیاست" جناب میر عابد علی خاں صاحب پر عاید ہوتی ہے۔

ان ہی بزرگوں اور سرپرستوں کے حکم کی تعمیل میں ۱۲ راگست ۱۹۶۲ء کو دن کے ٹھیک ساڑھے دس بجے سے مزاح نگاری کا آغاز کیا اور یہ نان اسٹاپ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔ لوگ پیٹ کے لئے روتے ہیں اور میں پیٹ کے لئے ہنسنے لگا اور اب تک ہنستا جارہا ہوں۔

میرا پہلا مزاحیہ مضمون "غالب کے طرفدار" ۱۹۶۲ء میں "صبا" میں چھپا تھا اور میری عین تمنا یہ ہے کہ میرا آخری مضمون بھی "صبا" ہی میں چھپے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "صبا" میرے آخری مضمون کو شائع کرنے کے انتظار میں مزید ۷۰، ۸۰ برس تک نکلتا رہے۔ آمین ثم آمین۔

چونکہ اب تک فرضی ناموں سے مزاح نگاری کرتا آیا ہوں۔ اس لئے مجھے وہ چیز نہ ملی جسے شہرت کہتے ہیں۔ یوں بھی میں شہرت سے دور بھاگتا ہوں۔

مشہور ماہنامہ "یونم" میں عرصہ تک فرضی نام سے مستقل مزاحیہ کالم بھی لکھتا رہا۔

اس مجموعہ کے اکثر مضامین میرے عزیز ترین دوست ناصر کرنولی ایڈیٹر "یونم" کی فرمائش پر ہی میں نے لکھے۔ ناصر کرنولی پٹھان ہے اور مجھ سے مضامین لکھوانے کے معاملے میں بھی اس نے وہی رویہ اختیار کیا جو سود خوار پٹھان سود کی وصولی کے سلسلہ میں اختیار کرتے ہیں۔ مضمون کے لئے ناصر کرنولی کا تقاضا کبھی کبھار اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ میں دن میں گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ اور ناصر کو دور ہی سے دیکھ کر راہ فرار اختیار کرلیتا تھا۔ میرے اکثر مضامین کی شان نزول صرف اتنی ہے کہ میں ایک "پٹھان ایڈیٹر" کے پنجے میں گرفتار ہوگیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں کہ اگر ناصر نے مجھ پر ظلم نہ ڈھایا ہوتا تو شاید میں یہ مضامین نہ لکھ پاتا۔ مضمون لکھنے کے معاملہ میں نہایت لاپرواہ واقع ہوا ہوں۔ جب تک کوئی آفت سر پر نازل نہیں ہوجاتی اس وقت تک میرے لئے مزاح لکھنا ناممکن ہے۔

میرے دوست احباب اتنے زیادہ ہیں کہ میں ہمیشہ ان کے نام بھول جاتا ہوں۔ حلقۂ

احباب کو وسیع کرنے کا اس لئے قائل ہوں کہ اس طرح قرض مانگنے میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ جس شخص کے دوست احباب کم ہوتے ہیں اس کی مالی حالت ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ دوستوں کی محفلوں میں وقت برباد کرنا میرا محبوب مشغلہ ہے۔ غالبؔ، نطشےؔ، مارک ٹوئینؔ، پطرسؔ، اسٹیفن لیکاکؔ، کرشن چندرؔ، راجندر سنگھ بیدیؔ، شفیق الرحمٰنؔ، رشید احمد صدیقیؔ، کنہیا لال کپورؔ، احمد ندیم قاسمیؔ، ابن انشاؔ، فکر تونسوی اور ابراہیم جلیس (جو اتفاق سے میرے بھائی بھی ہیں) میرے پسندیدہ ادیب ہیں۔ غالبؔ کی شاعری کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ آدمی غالبؔ کی شاعری کو پسند کرنے پر مجبور ہے۔ لہذا غالبؔ سے میری عقیدت ایک مجبوری سی ہے۔ نطشےؔ کا فلسفہ، غالبؔ کا دیوان اور پطرس کے مضامین مجھے زبانی یاد ہیں ــــ پطرسؔ کے مضامین کو اتنی بار پڑھ چکا ہوں کہ جب کبھی میرا جی "مضامینِ پطرس" کو پڑھنا چاہتا ہے تو میں کتاب کی مدد کے بغیر ہی انھیں پڑھ لیتا ہوں۔ نئے مزاح نگاروں میں مشتاق احمد یوسفی کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ انھیں پڑھ کر آدمی رشید احمد صدیقی اور پطرس کے مضامین کو الگ الگ پڑھنے کی ذمہ داری سے بچ جاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کا مزاح رشید احمد صدیقی اور پطرس کے مزاح کا حسین امتزاج ہے۔

ہنسنے کو ایک مقدس فرض جانتا ہوں اور قہقہہ لگانے کو دنیا کا سب سے بڑا ایڈونچر۔ سائنس کی ترقی نے انسان کی شخصی مہماتی زندگی کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ امریکہ کو کولمبس نے دریافت کر لیا۔ ماؤنٹ ایورسٹ کو تنزِنگ نے فتح کر لیا۔ سائنس دانوں نے چاند پر کمندیں پھینک دیں۔ اب عام آدمی کے پاس ایڈونچر کے لئے باقی ہی کیا بچا ہے۔ لے دے کے وہ صرف قہقہہ ہی لگا سکتا ہے۔ اور جب کوئی شخص کھل کر قہقہہ لگاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے امریکہ کو دوبارہ دریافت کر لیا ہو یا اس نے ماؤنٹ ایورسٹ کو پھر سے

سر کر لیا ہو ۔ زندگی کے بے پناہ غموں میں گھرے رہنے کے باوجود انسان کا قہقہہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے وسیع سمندر میں بھٹکے ہوئے ایک جہاز کو اچانک کوئی جزیرہ مل جائے ۔

میں اب تک چھ مرتبہ جنرل سکریٹری بن چکا ہوں ۔ گلبرگہ کالج میں پڑھتا تھا تو طلبا ء کی انجمن کا جنرل سکریٹری تھا ۔ آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں بھی مجھے اسی عہدہ سے نوازا گیا ۔ ایک ادبی انجمن قائم کی تو اس کا بھی جنرل سکریٹری ہی رہا ۔ ۱۹۶۶ء میں مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کا بھی جنرل سکریٹری ہی رہا ۔ پھر اگست ۱۹۶۷ء میں "جشن مزاح" منعقد ہوا تو تب بھی جنرل سکریٹری ہی بنا رہا ۔ جنوری ۱۹۶۸ء میں مجھے "زندہ دلان حیدرآباد" کا جنرل سکریٹری بنایا گیا ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اپنی موت تک جنرل سکریٹری شپ سے آگے نہ بڑھوں گا ۔ حیدرآباد میں اب تک مزاح نگاروں کے تین بڑے اجتماعات منعقد کروا چکا ہوں ۔ اس ضمن میں اپنے عزیز دوست حفیظ قیصر کی چالاکی کا قائل ہوں کہ وہ ہر بار مجھے اُکسا کر مزاح نگاروں کا ہنگامہ کھڑا کروا دیتا ہے اور جب میں اس ہنگامے میں بُری طرح پھنس جاتا ہوں تو وہ دور کھڑا میرا تماشہ دیکھتا رہتا ہے ۔ ایسے موقعوں پر مجھے شبہ سا ہونے لگتا ہے کہ مزاح نگار میں ہوں یا حفیظ قیصر کیونکہ اس نے مزاح نگاروں کے دو بڑے اجتماعات کی صورت میں میرے ساتھ دو مرتبہ عملی مذاق کیا ہے ۔

مجھے فائن آرٹس اکیڈیمی کے روح رواں حمایت اللہ سے بھی یہ شکایت ہے کہ وہ کبھی مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے ۔ حمایت کے ذہن پر ہمیشہ طنز و مزاح کا بھوت سوار رہتا ہے ۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی اسکیم ان کے ذہن میں کلبلاتی رہتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم سب مزاح نگاروں کے ہنگاموں میں گرفتار ہو جاتے ہیں ۔ حیدرآباد میں طنز و مزاح کی وبا کو عام کرنے میں حمایت کی سازشوں کو بڑا دخل ہے ۔

میں اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں اپنے محترم اُستاد ڈاکٹر حفیظ قتیل کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کے مسودے پر نظرثانی کی، اور ازراہِ ہمت افزائی زبان وبیان کی کم سے کم غلطیوں کی نشان دہی کی۔ انھیں غالباً یہ اندیشہ تھا کہ اگر مسودے میں زبان کی زیادہ سے زیادہ غلطیاں نکالی جائیں تو اس طرح میری دل شکنی ہوگی۔

اپنا تعارف ختم کرانے سے پہلے یہ عرض کرتا چلوں کہ
میرے آبا واجداد ایران کے رہنے والے تھے اور درّۂ خیبر کے راستے سے ہندوستان آئے تھے اور اب میں اسی راستے سے ہندوستان سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرے آبا واجداد جس وقت ہندوستان آئے تھے اس وقت ملک میں راشننگ نافذ نہیں تھی اور نہ ہی فیملی پلاننگ کا چرچا تھا۔

مجتبیٰ حسین

۲۱ر فروری ۱۹۶۸ء

تکیہ کلام

"تکیہ کلام" سے یہاں ہماری مراد وہ تکیہ کلام نہیں جو بات چیت کے دوران میں بار بار مداخلت جا دیے جا کرتا ہے بلکہ یہاں تکیہ کلام سے مراد وہ کلام ہے جو تکیوں پر زیور طبع سے آراستہ ہوتا ہے اور جس پر آپ اپنا سر رکھ کر سو جاتے ہیں اور جو آپ کی نیندیں "حلال" کرتا ہے۔ برسوں کی بات ہے کہ ہم نے ایک محفل میں غالب کا شعر پڑھا ؂

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

اس شعر کو سن کر ایک صاحب پہلے تو چونکے، پھر گہری سوچ میں غرق ہو گئے اور اپنا سر کھجاتے ہوئے بولے: "اگر میرا حافظہ خراب نہ ہوا ہو تو یہ شعر میں نے ضرور کہیں پڑھا ہے۔" ہم نے ان کی یادداشت کا امتحان لینے کی خاطر پوچھا" تب تو سوچ کر بتایئے کہ

"آپ نے یہ شعر کہاں پڑھا تھا؟" وہ کچھ دیر سوچ کر بولے: "بھئی! لو یاد آیا۔ یہ شعر ہم نے رحمٰن خاں ٹھیکیدار کے تکیہ کے غلاف پر پڑھا تھا۔ بھلا تمہیں یہ شعر کس طرح یاد ہوگیا؟ کیا تمہیں بھی اس تکیہ پر سونے کا اتفاق ہوا تھا؟" ہم نے کہا: "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ شعر تو دیوانِ غالب میں موجود ہے۔ رحمٰن خاں ٹھیکیدار سے ہمارا کیا تعلق؟" اس پر وہ بولے "بھئی! دیوانِ غالب سے ہمارا کیا تعلق۔ ہم تو شعر و شاعری صرف تکیوں کے غلافوں پر پڑھ لیتے ہیں۔ جب شاعری آپ کو تکیوں کے غلافوں پر پڑھنے کو مل جاتی ہے تو اس کے لئے شعراء کے دواوین اُلٹنے پلٹنے کی کیا ضرورت ہے؟" ان صاحب کے جواب کو سُن کر ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ جس زبان میں شعر و شاعری کی بہتات ہوتی ہے اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ شاعری کا "پیمانۂ صبر" جب لبریز ہو جاتا ہے تو اشعار چھلک کر تکیوں پر گر جاتے ہیں، چادروں پر بکھر جاتے ہیں، لاریوں کی پیشانیوں پر چپک جاتے ہیں، رکشاؤں کی پیٹھ پر بیٹھ جاتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ دستر خوانوں تک کی زینت بن جاتے ہیں۔ کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ ہم دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھے ہیں کہ اچانک دستر خوان پر چھپے ہوئے کسی شعر نے ہمیں چونکا دیا۔ اور ہم کھانا کھانے کی بجائے سر دُھنتے رہ گئے۔ بعض سخن فہم حضرات تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو دستر خوانوں پر فارسی میں اشعار لکھواتے ہیں، جیسے ؎

شکر بجا آر کہ مہمانِ تو
روزیٔ خود می خورد از خوانِ تو

نتیجہ ان فارسی اشعار کی اشاعت کا یہ ہوتا ہے کہ مہمان کھانا کم کھاتے ہیں اور شعر کے معنیٰ و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش زیادہ کرتے ہیں ـــــــــ اور جب وہ معنیٰ و مفہوم کے چکّر سے آزاد ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ میزبان نے سارا کھانا خود ہی کھا لیا ہے۔

دستر خوانوں کے اشعار کی بات چھوڑیئے، کیونکہ اب ہم دستر خوانوں پر چُنی جانے والی اشیائے خورد و نوش میں مختلف ملاوٹوں کے علاوہ اشعار کی ملاوٹ کے بھی عادی ہو گئے

ہیں لیکن یہاں بات تکیوں اور ان کے کلام کی چل رہی ہے۔ ہم نے ایسے معرکۃ الآرا شعر تکیوں پر دیکھے ہیں کہ اگر کوئی ان تکیوں پر سو جائے تو پھر زندگی بھر ان تکیوں پر سے اُٹھنے کا نام نہ لے۔

ہمیں ایک بار سفر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک شناسا کے ہاں مہمان ٹھیرے۔ چونکہ ہم حسبِ روایت بستر اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے اس لئے میزبان نے ہمارے بستر کا انتظام کیا اب جو ہم بستر پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ تکیہ پر نہایت جلی حروف میں یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

کسی کے حُسن کا جادو بسا ہے تکیہ میں
جہانِ عارض و گیسو بسا ہے تکیہ میں

اب آپ سے کیا بتائیں کہ ہمارے حق میں یہ بستر' بسترِ مرگ ثابت ہوا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے' اختر شماری تک کرتے رہے۔ ہر بار یہی سوچتے رہے کہ آخر تکیہ میں کس کے حُسن کا جادو بسا ہے' آخر وہ کون مہ جبین ہے جس کا جہانِ عارض و گیسو اِس تکیہ میں پنہاں ہے۔ بار بار تکیہ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس تکیہ نے ہم میں وہ سارے آثار پیدا کر دیے جو آغازِ عشق کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ وفورِ عشق نے اتنا سر اُٹھایا کہ ہم بار بار تکیہ پر اپنا سر پٹختے رہے۔ بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح ہو گی تو ہم اس نازنین کو ضرور دیکھیں گے جس کے حُسن کا جادو اس تکیہ کے توسط سے ہمارے سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔

صبح ہوئی تو ہم نے چوری چھپے اس نازنین کو دیکھ ہی لیا۔ اس نازنین کے ڈیل ڈول اور وضع قطع کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ محترمہ کو یہ شعر تکیہ پر نہیں' گاؤ تکیہ پر لکھنا چاہئے تھا۔ کیونکہ ان کے حُسن کا "سمبل" صرف گاؤ تکیہ ہی ہو سکتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد تکیہ کے اشعار پر سے نہ صرف ہمارا ایقان اُٹھ گیا بلکہ جب

بھی کوئی منظوم تکیہ ہمارے سر کے نیچے آیا تو ہم نے چپکے سے اس کا غلاف اُتار لیا کہ کون اپنی نیند حرام کرے۔ آپ نے تکیوں کے وہ اشعار ضرور پڑھے ہوں گے جن پر سو کر آپ نہایت ڈراونے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کونین تک سمیٹ لئے ہیں غلاف میں
ٹکڑے جگر کے ٹانک دیئے ہیں غلاف میں

+

خواب ہائے دل نشیں کا اِک جہاں آباد ہو
تکیہ جنّت بھی اُٹھا لائے اگر ارشاد ہو

+

چمن در چمن ہے غلاف آیئے تو
ذرا اِس پہ آرام فرمایئے تو

+

غنچہ ہائے دل کھِلے، سر رکھ کے گستاخی معاف
گلشنِ اُمید کے سب پھول چُن لایا غلاف

غور فرمایئے کہ ان اشعار پر کیا آپ "تکیہ" کر سکتے ہیں؟ گویا تکیہ نہ ہوا، الٰہ دین کا چراغ ہوا کہ کونین تک اس میں سمٹ کر آ گئے۔

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے ایک دوست کو ادھورے خواب دیکھنے کی بیماری تھی، وہ تھوڑا سا خواب دیکھتے کہ بجلی فیل ہو جاتی اور وہ نیند سے چونک پڑتے۔ ایک دن ہم سے بولے: "بھئی! عجیب بات ہے کہ مجھے ادھورے خواب نظر آتے ہیں۔ آخر

پورے خواب کیوں نظر نہیں آتے ۔ میں خوابوں کے "ٹریلر" دیکھتے دیکھتے عاجز آگیا ہوں۔" ہم نے ان کے بستر کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ تکیہ پر ایسا شعر لکھا ہوا ہے جو "بحر" سے خارج ہے ۔ اس پر ہم نے کہا :

" بھئی ! اس کا اصل راز یہ ہے کہ تم ایسے تکیہ پر سوتے ہو جس پر بے بحر شعر لکھا ہوا ہے اور اس تکیہ کی کرامت سے تمہارے خواب بھی بحر سے خارج ہو جاتے ہیں ۔ اس شعر کو بدلو تو تمہارے خوابوں کی صحت بھی بہتر ہو جائے گی ۔"

یہ تو ایک معمولی سا واقعہ ہے ۔ ہمارے ایک اور دوست کا قصہ ہے کہ انھیں عرصہ سے بلڈ پریشر کی شکایت تھی ۔ جب وہ بستر پر سو جاتے تو ان کا بلڈ پریشر آسمان سے باتیں کرنے لگتا ۔ جب ایلوپیتھی علاج سے فائدہ نہ ہوا تو ایک حکیم صاحب کی خدمات حاصل کیں ۔ حکیم صاحب نے ان کا بغور معائنہ کیا ۔ زبان اتنی بار باہر نکلوائی کہ وہ ہانپنے لگے ۔ مگر اسی اثنا میں حکیم صاحب کی نظر تکیہ پر پڑی اور وہ تکیہ کی جانب لپکے ، شعر کو غور سے پڑھا اور تنک کر بولے :

" اس تکیہ کو ابھی یہاں سے ہٹائیے ۔ بلڈ پریشر کی اصل جڑ تو یہ تکیہ ہے ۔ واہ صاحب واہ ! کمال کر دیا آپ نے ۔ آپ کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور آپ نے شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا شعر تکیہ پر طبع کروا رکھا ہے ۔ جانتے ہو جوش کی شاعری میں کتنا جوش ہوتا ہے ۔ جوش کے شعر پر آپ سو جائیں گے تو دورانِ خون نہیں بڑھے گا تو اور کیا ہوگا ؟ اس تکیہ کو اسی وقت یہاں سے ہٹائیے ۔ خبردار جو آئندہ سے آپ نے جوش کے تکیہ پر سر رکھا ۔ اگر شعروں پر سونا ایسا ہی ضروری ہے تو داغ کے غلاف

پر سو جائیے، جگرؔ کے غلاف کو اپنے سر کے نیچے رکھیے۔ ان شعراء کا کلام آپ کے بلڈ پریشر کو کم کر دے گا۔ آپ کو فرحت ملے گی، بھوک زیادہ لگے گی آپ کے جسم میں خون کی مقدار میں اضافہ ہوگا وغیرہ وغیرہ "

حکیم صاحب کے اس مشورے کے بعد ہمارے دوست نے نہ صرف "جوشؔ کا غلاف" بدل دیا بلکہ اب وہ جوشؔ کے کلام کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں کہ کہیں پھر بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق نہ ہو جائے ۔

لیکن تکیوں کے کلام کی ایک افادیت بھی ہوتی ہے جس کا راز صرف اہلِ دل ہی جانتے ہیں۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں کہ ایک اہلِ دل کی شادی صرف تکیوں کے اشعار کے باعث ہوئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ یہ صاحب کہیں مہمان گئے ہوئے تھے۔ رات میں میزبان کے گھر میں سے ان کے لئے جب بستر آیا تو اس میں ایک تکیہ بھی تھا، جس پر یہ شعر لکھا تھا ؎

شمیمِ طُرّۂ گیسوئے یار لایا ہوں
میں اپنے ساتھ چمن کی بہار لایا ہوں

آدمی چونکہ ہوشیار تھے، اس لئے اس غلاف کا مطلب سمجھ گئے۔

دوسرے دن بازار گئے اور ایک ریڈی میڈ غلاف خرید لائے، جس پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

اُٹھا تو سر پٹک دیا تکیہ پہ بار بار
شب بھر گواہ، یہ بھی مرے دردِ دل کا تھا

انھوں نے چپکے سے تکیہ کا پُرانا غلاف اُتارا اور نیا غلاف اس پر چڑھا دیا۔ اب یہ تکیہ ان کا پیام لے کر اندر واپس ہوا۔ نہ جانے اس شعر نے کیا قیامت مچائی۔ شام میں جب پھر تکیہ واپس ہوا تو اس پر ایک نیا شعر لکھا ہوا تھا ؎

مرا جذبِ دل مرے کام آ رہا ہے
اب ان کی طرف سے پیام آ رہا ہے

دوسرے دن، ان صاحب نے یہ غلاف بھی اُتار لیا اور پھر ایک طبع زاد غلاف چڑھا دیا ؎

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

غرض اس "تکیہ بردار" عشق نے وہ جوش مارا کہ سلام و پیام کا سلسلہ بڑھتا رہا اور بالآخر ان دونوں کی شادی ہوگئی چنانچہ اب یہ دونوں ایک ہی شعر پر تکیہ کر رہے ہیں۔ لیکن اب ان کے تکیوں کے اشعار کی ماہیت تبدیل ہوگئی ہے۔ چنانچہ ہم نے پرسوں ان کی خواب گاہ میں جو تازہ تکیہ دیکھا تھا اس پر یہ شعر درج تھا ؎

اس سیہ بخت کی راتیں بھی کوئی راتیں ہیں
خوابِ راحت بھی جسے خوابِ پریشاں ہو جائے

یہ تو خیر عام آدمیوں کے تکیوں کی بات تھی۔ اگر آپ دانشوروں کے تکیوں کو دیکھیں گے تو یقیناً دنگ رہ جائیں گے۔ ان کے تکیوں پر ایسے صوفیانہ اور فلسفیانہ اشعار لکھے جاتے ہیں کہ اچھا خاصا آدمی بھی فلسفی بننے کی کوشش کر بیٹھتا ہے۔ مثلاً ایک انٹلکچول نے اپنے تکیہ پر یہ شعر لکھ رکھا تھا ؎

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

سچ پوچھئے تو اس تکیہ پر کوئی عام آدمی سو ہی نہیں سکتا۔ ایسے فلسفیانہ شعر پر تو صرف ایک دانشمند ہی سو سکتا ہے اور اسی کو ایسے فلسفیانہ تکیے زیب دیتے ہیں۔

آیئے، اب ذرا شعراء کے تکیوں کی بات ہو جائے جن کے لئے شاعری اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے۔ یعنی ان کے تکیوں پر شعر ہوتے ہیں۔ حد ہوگئی کہ ہم نے ایک شاعر کی مچھردانی پر بھی شعروں کا جنگل اُگا ہوا دیکھا۔ ہم نے ایک شاعر کے گھر میں ایک منظوم تکیہ دیکھا جس پر یہ شعر درج تھا ؎

یار سوتا ہے بصد ناز بصد رعنائی
محوِ نظارہ ہوں بیدار کروں یا نہ کروں

ہم نے اس شعر کو پڑھ کر کہا: "بھئی واہ کیا خوب شعر کہا ہے، کس کا شعر ہے؟"
ہمارے سوال کو سن کر ان کا چہرہ تمتما اٹھا اور بولے: "معاف کیجئے، میں کسی دوسرے کے کلام پر تکیہ نہیں کرتا۔ یہ شعر میرا ذاتی ہے اور یہ بات میری خودداری کے خلاف ہے کہ میں دوسروں کے اشعار پر سو جاؤں۔ آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کوئی شاعر اپنے تکیہ پر میر کے تکیہ کا شعر لکھ مارے ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ہم نے ان کا غصہ تاڑ کر معافی مانگ لی اور چپ ہو رہے۔ بعد میں ان کے گھر کی اشیاء پر جو نظر ڈالی تو ہر شئے شعر میں لت پت نظر آئی۔ پھر بہت دنوں بعد پتہ چلا کہ شاعرِ موصوف کی جو غزلیں مختلف رسالوں سے "ناقابلِ اشاعت" قرار پاکر واپس آتی ہیں، انھیں وہ اپنے گھر کی چادروں پر چھپوا دیتے ہیں، تکیوں کے غلافوں پر چڑھا دیتے ہیں اور میز پوشوں پر زیورِ طبع سے آراستہ کرتے ہیں۔ ہم تکیوں کے ذریعہ ادب کی ترقی کے ضرور قائل ہیں لیکن ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ ناقابلِ اشاعت اشعار بھی تکیوں پر چھاپے جائیں۔ پھر جب ہماری شاعری میں نئے رجحانات آرہے ہوں تو تکیوں میں بھی نئے

رجحانات کا آنا نہایت ضروری ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی سخن فہم اپنے تکیہ پر آزاد نظم لکھوائے۔ اگر تکیہ اس نظم کو قبول کرنے میں تنگ دامنی کا شکوہ کرے تو اس نظم کو دو تین تکیوں پر شائع کیا جائے۔ مثلاً نظم کا ایک بند تو ایک تکیہ پر ہو اور اس کے نیچے یہ عبارت درج ہو :

" براہ کرم تکیہ اُلٹیے۔"

اور تکیہ اُلٹنے پر بھی کام نہ بنے تو نیچے یہ عبارت لکھی جائے :

" باقی نظم ملاحظہ ہو گاؤ تکیہ نمبر (۱) پر۔"

اور گاؤ تکیہ بھی اس کی طوالت کو برداشت نہ کر سکے تو اس کے نیچے لکھا جائے :

" باقی نظم ملاحظہ ہو شطرنجی کلاں پر۔"

اور جب یہ نظم ختم ہو جائے تو اس کے نیچے "غیر مطبوعہ" کے الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ "منظوم تکیوں" کے شائقین اپنے تکیوں کو شاعری کے جدید رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی فرمائیں گے۔

سب سے آخر میں ہم اس مضمون کے لئے ان خاتون کے تہ دل سے ممنون ہیں جن سے ہم نے تکیوں کے چند اشعار مانگے تو انھوں نے اپنے نوکر کو ہمارے گھر بھیجا۔ اس نوکر نے آتے ہی ہم سے کہا :

" صاحب اپنے نوکر کو باہر بھیجئے تاکہ وہ تکیے کے اشعار رکشا میں سے اُتار سکے۔"

ہم نے حیرت سے پوچھا ـــ : " تمہاری بیگم صاحبہ نے آخر اتنے اشعار کیوں بھیجے کہ انھیں رکشہ میں ڈال کر ہمارے یہاں لانا پڑا ؟"

وہ بولا : " صاحب ' آپ نے بیگم صاحبہ سے تکیہ کے اشعار مانگے تھے اور انھوں نے اپنے گھر کے سارے تکیے آپ کے پاس بھجوا دیئے ہیں ' آپ ان تکیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد

انھیں واپس بھیج دیجئے ۔"

ہم اس دھوبی کے بھی شکر گزار ہیں جو گھاٹ پر کپڑے دھو رہا تھا ۔ ہم نے اس دھوبی کو دیکھا کہ وہ ایک کپڑا پانی میں سے نکالتا ہے، اسے کھولتا ہے، پھر اپنی عینک آنکھوں پر لگاتا ہے، کپڑے پر کوئی عبارت پڑھتا ہے اور پھر اس کپڑے کو پتھر پر زور زور سے پٹخنے لگتا ہے ۔ ہم نے اس کی اس حرکت کا بغور مشاہدہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ بعض کپڑے تو زور سے پٹختا ہے اور بعض کپڑے نہایت آہستگی اور سلیقے سے دھوتا ہے ۔

ہم نے پوچھا : " بھئی ! تم بعض کپڑے زور سے پٹختے ہو اور بعض نہایت آہستگی سے ۔ آخر یہ کیا راز ہے ؟"

وہ بولا : " صاحب ! یہ دراصل تکیے کے غلاف ہیں اور میں تکیے کے ہر غلاف کو دھونے سے پہلے اسے کھولتا ہوں اور اس پر لکھا ہوا شعر پڑھتا ہوں ۔ اگر شعر مجھے پسند نہ آئے تو اس غلاف کو زور زور سے پتھر پر پٹختا ہوں، یعنی ادبی اصطلاح میں ہوٹنگ کرتا ہوں اور اگر اتفاق سے کوئی شعر پسند آئے تو اسے نہایت سلیقے سے دھوتا ہوں کہ اچھا شعر ساری قوم کی امانت ہوتا ہے ۔"

ہم اس ادب دوست دھوبی اور اس کے گدھے کے بھی، جو اُن اشعار کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے پھرتا ہے، ممنون ہیں کہ اس نے بعض اچھے اشعار ہمیں فراہم کیے جو اس مضمون میں شامل نہیں ہیں ۔

میرا سلام کہیو
اگر نامہ بر ملے

کہتے ہیں کہ ایک نوجوان سرکاری ملازم کا ٹرانسفر کسی دوسرے شہر پر ہوگیا اور وہ پہلے شہر میں اپنی ایک عدد محبوبہ کو چھوڑ گیا۔ سو یہ نوجوان آٹھوں پہر اپنی محبوبہ کے غم میں نڈھال رہتا اور آٹھ پہروں میں سے چار پہر اپنی محبوبہ کو خط لکھنے میں گنوا دیتا۔ عالم اس نوجوان کا یہ تھا کہ ہر دو گھنٹے بعد وہ اپنی محبوبہ کو ایک ایکسپریس ڈیلیوری خط لکھتا اور اسے لیٹر بکس میں ڈال آتا۔ اس کی خطوط نویسی کی شہرت چہار دانگ آفس میں پھیل چکی تھی۔ اس کے احباب اس کی یہ حالت دیکھ کر کفِ افسوس ملتے اور جب انھیں کفِ افسوس ملنے سے فرصت ملتی تو اسے سمجھانے کی کوشش کرتے کہ اے عاقبت نا اندیش اپنے دل پر قابو رکھ اور دل سے زیادہ اپنے قلم پر کہ "بسیار نویسی" ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔ مگر" وہ نہ مانا اور ہر دو گھنٹے بعد اپنی محبوبہ کو خط لکھتا رہا۔ پھر خدا کا

کرنا یوں ہوا کہ ایک دن اس نوجوان کا ٹرانسفر پھر کسی دوسرے شہر میں ہوگیا۔ پھر دن گزرتے گئے، منٹ گھنٹوں میں اور گھنٹے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے، موسم بدلتے رہے، حکومتیں بدلتی رہیں، اشیاء کی قیمتیں چڑھتی رہیں اور اناج مہنگا ہوتا رہا۔ اس نوجوان کے احباب اسے بھول بھال گئے۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ایک دن اس نوجوان کا ایک پرانا ساتھی سڑک پر مل گیا۔ دونوں بہت خوش ہوئے اور اپنی اپنی داستانِ غم سنانے کے لئے ایک ہوٹل میں چلے گئے۔

نوجوان کے دوست نے پوچھا: "کہو یار تمہارا کیا حال ہے؟"

وہ بولا: "بھئی اچھا ہوں اور زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں"۔

پھر دوست نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے پوچھا: "یار، تم نے تو اپنی اس محبوبہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جسے تم ہر روز چار خطوط لکھا کرتے تھے"۔

اس پر نوجوان زار و قطار رونے لگا پھر بولا: "بھئی تم اس بے وفا کا ذکر کیوں چھیڑتے ہو؟ اس نے تو میرے ساتھ ایک سنگین مذاق کیا تھا۔"

دوست بولا "بھئی آخر بات کیا ہوئی؟"

وہ بولا: "بات کیا ہوتی۔ اس بے وفا نے بالآخر اس پوسٹ مین سے شادی کرلی، جو اسے ہر روز دن میں چار مرتبہ خطوط پہنچایا کرتا تھا۔ پھر بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی۔ اس ظالم نے میری یک طرفہ محبت کے آخری دنوں میں یہاں تک لکھا تھا کہ:

"میرے دیوتا! تم اگر دو گھنٹوں میں ایک خط لکھنے کی بجائے ایک گھنٹہ میں دو خط لکھ سکو تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا، کیونکہ میں بہت بے چین رہتی ہوں اور مجھ سے ہجر کے دو گھنٹے بھی کاٹے نہیں کٹتے"۔

"میں جنم جنم کا پاگل ٹھہرا۔ میں نے اس کی فرمائش پوری کردی۔ ایک گھنٹہ میں چار

چار خط لکھنے لگا۔ اِدھر میری خطوط نویسی جاری رہی، ادھر پوسٹ مین سے اس کا عشق پروان چڑھتا رہا۔"

یہ کہہ کر نوجوان پھر رونے لگا اور بولا: "اس نے میرے وہ سارے خطوط بذریعہ دی پی واپس کر دیئے ہیں جو میں نے اسے لکھے تھے۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ جملہ ۸ ہزار محبّت ناموں میں سے صرف ابتدائی چھ محبت نامے کھلے ہوئے پائے گئے۔ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ میری محبت صرف چھ محبت ناموں تک اس کے دل میں قائم رہی اور بقیہ محبت نامے تو کسی اور کی محبت کی نذر ہو گئے۔"

تو صاحبو! یہ واقعہ اتنا عبرت انگیز اور اثر انگیز اور نہ جانے کیا کیا انگیز ہے کہ کوئی بھی اسے سُن کر پوسٹ مین سے خائف ہو سکتا ہے اور وہ جو غالب نے کہا تھا ؂

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تو غالب نے غالباً ایسے ہی کسی خطوط رساں کے بارے میں کہا تھا جو محبت نامے کر کسی اور کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ سچ پوچھئے تو ہمیں نامہ بری کا وہ قدیم طریقہ اب بھی پسند آتا ہے جب لوگ کبوتروں کے ذریعہ محبت نامے روانہ کیا کرتے تھے۔ یہاں نہ تو رازداں کے اچانک رقیب بننے کا ڈر تھا اور نہ خطوط کی دیر سے تقسیم کا اندیشہ۔ اگر کبھی دیر ہو جاتی تو وہ بھی نذرِ محبت ہو جاتی۔ فرض کیجئے کہ نامۂ محبت لے جانے والے کبوتر کی راستے میں کسی کبوتری سے ملاقات ہو جاتی تو یہ کوئی ایسی خطرناک بات نہ تھی۔ کبوتر جب اظہارِ محبت کر لیتا تھا تو پھر نامۂ محبت لے کر اپنے مالک کی محبوبہ کے پاس روانہ ہو جاتا تھا۔ کم از کم وہ اپنے مالک کو دھوکہ تو نہ دے سکتا تھا۔ مگر اِدھر جب سے محبت "بذریعہ ڈاک" ہونے لگی ہے اور مندرجہ بالا قسم کے واقعات پیش آنے لگے ہیں لوگ پوسٹ مینوں

سے خائف رہنے لگے ہیں ۔ ہم نے بعض ایسے خوبرو پوسٹ مین بھی دیکھے ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح غالب نے مہ رخوں کے لئے مصوری سیکھی تھی اسی طرح ان چھیل چھبیلے پوسٹ مینوں نے صرف مہ رخوں کی خاطر خطوط رسانی کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ ان حالات میں ہمارے اس دوست کی دُور اندیشی بالکل بجا اور درست ہے جو پہلے تو اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے اور پھر خود ہی پوسٹ مین کا لباس پہن کر اس خط کو تقسیم کر آتا ہے کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری ۔

مگر ہم کہیں گے کہ ہماری زندگی سے پوسٹ مین کا ربط ضبط بڑا گہرا ہوتا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں اپنے حلقے کے سارے افراد کی دکھتی رگیں ہوتی ہیں ۔ وہ یہ خوب جانتا ہے کہ زید صاحب مقروض ہیں، بکر کے گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں، عمر کے اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہیں، زید نے چھ ماہ سے مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا، بکر کی چھے ۶ لڑکیاں شادی کے قابل ہیں لیکن کوئی لڑکا اس قابل نہیں ہے کہ وہ جہیز کے بغیر ان کی کسی لڑکی سے شادی کرے ۔ عمر کی لڑکی زید کے لڑکے سے محبت کرتی ہے اور خود زید کا لڑکا بکر کی لڑکی سے محبت کرتا ہے ۔ غرض پوسٹ مین کو ان ساری باتوں کا علم ہوتا ہے ۔ دور کیوں جائیے خود ہماری مثال لے لیجئے کہ جب بھی اپنے حلقہ کے پوسٹ مین سے راستہ میں ہماری مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو ہم مارے شرم کے نگاہیں نیچی کر لیتے ہیں کہ نہ جانے اس پوسٹ مین کو ہمارے کتنے راز معلوم ہیں ۔ اسے یہ تک معلوم ہے کہ ہمارے کتنے افسانے ناقابلِ اشاعت قرار پا کر مختلف رسالوں کے دفتروں سے واپس آچکے ہیں ایک بار تو خود ہم نے اپنے کانوں سے اس کی بات چیت سنی تھی ۔ وہ اپنے ایک دوست سے کہہ رہا تھا :

" ارے وہ کیا خاک لکھے گا، مجھ سے پوچھو، اب تک اس کے پورے چوبیس

افسانے ناقابلِ اشاعت قرار پاکر رسالوں کے دفتروں سے واپس آچکے ہیں۔ اور اب تو میں نے رسالوں کو اس کے افسانوں سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کرلیا ہے۔ یعنی جب بھی یہ کسی رسالے کو افسانہ روانہ کرتا ہے تو میں ڈاک خانے سے ان افسانوں کو حاصل کرلیتا ہوں اور چند دنوں بعد یہ افسانے اسے دے آتا ہوں کہ قبلہ یہ افسانے بھی ناقابلِ اشاعت ہیں۔ مشق جاری رکھئے، جب آپ کا رنگ پختہ ہوجائے تو میں خود ان افسانوں کو رسالوں تک پہنچانے کا بندوبست کردوں گا۔ یوں محکمۂ ڈاک کے کام میں "ناقابلِ اشاعت" افسانوں کے ذریعہ اضافہ کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟"

یہ تو صرف افسانوں کی بات ہوئی مگر ہم اس وقت بڑے خائف رہتے ہیں جب ہمارا پوسٹ مین ہمارے والد محترم کا خط لے کر آتا ہے۔ ہم نے والد بزرگوار سے ہزار بار بذریعہ ڈاک خواہش کی کہ:

"مربی! ہمیں پوسٹ کارڈ پر ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی زحمت نہ کیجئے۔ اگر گالیاں دینی ہوں تو بذریعہ لفافہ روانہ کردی جائیں۔ آپ ادھر پوسٹ کارڈ پر گالیاں دیتے ہیں اور اِدھر پوسٹ مین ان گالیوں کو سُن لیتا ہے۔ آخر ہماری بھی کوئی عزت ہے۔ پھر پوسٹ کارڈ پر گالیاں دینا تو سرِ بازار گالیاں دینے کے مترادف ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب بھی آپ کا پوسٹ کارڈ آتا ہے تو پوسٹ مین ہمیں آپ کا خط دے کر اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگتا ہے، گویا کہہ رہا ہو ـــ "تو یہ ہیں آپ کے کرتوت۔ ذرا اس خط میں جھانک کر اپنی شخصیت کو پہچان لیجئے"۔ اور ہمیں چاروناچار اس پوسٹ مین کو ہوٹل میں لے جاکر چائے پلانی پڑتی ہے، منت سماجت کرنی پڑتی ہے کہ ـــ "میرے رازداں! خدا کے لئے ان گالیوں کا کسی سے ذکر نہ کرنا ـــ" پوسٹ مین وعدہ تو

کرلیتا ہے مگر جب بھی راستے میں ملتا ہے یوں اکڑ کر چلتا ہے جیسے ہم اس کے زرخرید غلام ہیں ۔"

پوسٹ مینوں سے ہم دست بستہ عرض کریں گے کہ جناب والا ہمارے سارے راز معلوم کر لیجئے مگر ہماری ڈاک بروقت پہنچایا کیجئے ۔ کیونکہ ڈاک بروقت نہ پہنچے تو کئی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ ہمارے ایک دوست نے آج سے پانچ سال پہلے ہماری شادی پر مبارکباد کا تار روانہ کیا تھا جسے پرسوں ہمارے پوسٹ مین نے عین اس وقت ہمارے حوالے کیا جب ہم سو رہے تھے ۔ اس نے رات کے پچھلے پہر ہمارے مکان پر دستک دی ۔ ہم نے نیند سے جاگ کر پوچھا : " کون ہے ؟" ۔۔ وہ بولا " پوسٹ مین ۔" ہمارا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ہماری بیوی بستر سے اُٹھ کر دیوانوں کی طرح بھاگی ۔ اس نے ٹیلی گرام پڑھا اور اس بات پر دنگ رہ گئی کہ ٹیلی گرام میں اس کے شوہر کو شادی کی مبارکباد دی جارہی ہے ۔ پوسٹ مین تو ٹیلی گرام دے کر چلا گیا مگر ہماری بیوی آج تک اسی شک میں مبتلا ہے کہ ہم نے ضرور خفیہ طور پر دوسری شادی رچالی ہے ' اگر نہیں رچائی ہے تو پھر یہ ٹیلی گرام کس خوشی میں آیا ہے ۔

اسی طرح ہمارے ایک اور دوست کا قصہ ہے کہ ان کی پہلی بیوی دو سال پہلے انتقال فرما چکی ہیں اور انھوں نے بفضل تعالیٰ دوسری شادی رچا کر غلطی کا اعادہ بھی کرلیا ہے ۔ مگر پرسوں انھیں اپنی پہلی بیوی کا ایک خط ملا ہے کہ وہ بہت جلد اپنے میکے سے سسرال آنے والی ہیں ۔ اب یہ صاحب پریشان ہیں کہ جب پہلی بیوی دوسری دنیا سے ان کے گھر واپس آئے گی تو وہ اسے کیا منہ دکھائیں گے اور دوسری بیوی سے کس طرح نجات پائیں گے ۔

اگر اس عید کے موقعہ پر بھیجا ہوا عید کارڈ اگلی عید کے موقعہ پر تقسیم کیا جاتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ۔ اور اگر محکمہ ڈاک کسی کی پہلی شادی پر بھیجا ہوا مبارکباد کا ٹیلی گرام ان کی دوسری شادی کے موقعہ پر تقسیم کرتا ہے تو ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں بلکہ ہم تو

یہاں تک کہیں گے کہ اگر کسی کی پیدائش کے موقعہ پر بھیجا ہوا ٹیلی گرام اس کی وفات کے موقعہ پر تقسیم کیا جائے تو یہ بھی کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں مگر جب وہ گڑھے مردے بذریعہ ڈاک اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے اور مردہ جسموں میں رُوح پھونک دیتا ہے تو ہماری روح قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے لئے بے چین ہوجاتی ہے اور ہم بھوتوں اور جنوں کے وجود پر ایمان لے آتے ہیں۔

ان حالات میں وہ صاحب کوئی غلطی نہیں کرتے جو اپنے ایک ہی خط کی تین تین نقلیں محفوظ رکھتے ہیں۔ پہلے اصل خط روانہ کرتے ہیں اور اس کے بعد مثنیٰ روانہ کرتے ہیں۔ پھر دوسرے خط کے مرحلہ پر ایک اور خط لکھ کر استفسار فرماتے ہیں کہ آیا آپ کو پچھلے دو خطوط ملے بھی یا نہیں۔ اگر نہیں ملے ہیں تو بہ واپسی ڈاک مطلع کیجئے تاکہ میں اس خط کی تیسری نقل بھی آپ کو بھیج دوں۔

یوں تو محکمۂ ڈاک کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں۔ مگر ہم یہاں صرف اس کے ادبی پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ اس کا یہی پہلو کافی تاریک ہے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ محکمۂ ڈاک نے ادب پر بڑے احسانات کئے ہیں۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ ان پوسٹ مینوں نے، جنھوں نے غالب کے خطوط تقسیم کئے تھے، اگر ان خطوط کی تقسیم میں ادبی بددیانتی کی ہوتی تو اُردو ادب میں کتنا بڑا خلاء نہ رہ جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ ڈیڈ لیٹر آفس کا خلاء بڑی حد تک پورا ہوجاتا۔ پھر اگر ڈاک کا بندولبت نہ ہوتا تو آنجہانی نہرو کی "گلمپسیس آف دی ورلڈ ہسٹری" کا کیا حشر ہوتا؟ صفیہ اختر کے خطوط کا کیا بنتا۔ اور پھر ان ادیبوں کا نہ جانے کیا حشر ہوتا جو خط صرف اس مقصد کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ خط ان کے انتقال کے بعد رسالوں میں سیاہ حاشئے کے ساتھ عکسی تحریر کے طور پر شائع کیا جائے گا۔

خطوط کی تقسیم سے ہٹ کر ان دنوں منوں، ٹنوں کے حساب سے ادب بذریعہ ڈاک

اِدھر سے اُدھر روانہ کیا جاتا ہے۔ ناقابلِ اشاعت افسانے واپس آتے ہیں۔ آزاد نظمیں بذریعہ ڈاک ضائع کی جاتی ہیں۔ غزلیں بذریعہ ڈاک سُنائی جاتی ہیں' رسالے بذریعہ ڈاک روانہ کئے جاتے ہیں اور ان ساری سرگرمیوں کے نتیجہ میں خواہ مخواہ ادب کی ترقی ہوتی جارہی ہے۔ ہم نے ڈاک خانوں میں کام کرنے والے ایسے کئی ملازم دیکھے ہیں جنھیں ادب سے بلا وجہ لگاؤ پیدا ہوگیا ہے۔ یہ لگاؤ بھی پیدا کیوں نہ ہوتا جب کہ سارا ادب ان ہی کے ہاتھوں پروان چڑھ رہا ہے۔ چنانچہ ہماری ان چشمِ گنہگار" نے کئی پوسٹ مینوں کو ادیب بنتے اور کئی ادیبوں کو پوسٹ مین بنتے دیکھا ہے۔ حوالے کے لئے ملاحظہ ہوں :

راجندر سنگھ بیدی' جنھوں نے دو سال تک ڈاک خانہ میں ملازمت کی تھی اور غالباً ڈاک خانہ کی اسی ملازمت نے انھیں ادیب بننے پر اکسایا تھا۔ بھئی جہاں سارے رسالے اور کتابیں آتی ہوں' وہاں ایک آدمی ادیب نہیں بنے گا تو کیا جوہری بنے گا۔ مگر ابھی تک ہم اس نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں کہ لوگ ادیب بننے کے لئے ڈاک خانہ میں ملازم ہوتے ہیں یا ڈاک خانہ میں ملازم ہونے کی وجہ سے ادیب بن جاتے ہیں۔ ہمیں تو موخرالذکر بات زیادہ امکانی نظر آتی ہے۔ کیونکہ ہم ایک پوسٹ مین کی داستان سے شخصی طور پر واقف ہیں جو پہلے تو صرف رسالے تقسیم کیا کرتے تھے مگر بعد میں رسالوں کی تقسیم کے ساتھ اپنی غزلیں بھی تقسیم کرنے لگے۔ چنانچہ اب وہ آتے ہیں اور ہمارا خط حوالہ کرنے سے پہلے کہتے ہیں۔ "اگر آپ کو اپنے خط کی ضرورت ہو تو آپ کو میری ایک تازہ غزل سماعت کرنی ہوگی" اور ہمیں اپنا خط حاصل کرنے کے لئے چارو ناچار ان کی غزل سننی پڑتی ہے۔ اگر کبھی ہمارے نام منی آرڈر آجائے تو سمجھئے کہ وہ دن ہمارے لئے روزِ قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ انھوں نے منی آرڈر کی رقم کے تناسب سے غزلیں سنانے کی شرح مقرر کر رکھی ہے۔ اگر دس روپے کا منی آرڈر آئے تو پانچ روپے فی غزل کی شرح سے ہمیں دو غزلیں سننی پڑتی

ہیں۔ ایک بار تو ہمیں ۳۰۰ روپے بذریعہ منی آرڈر ملے تھے اور آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ منجملہ ۶۰ غزلوں کی سماعت تک ہماری قوتِ سماعت کا کیا حال نہ ہوا ہوگا۔ ہم صرف اتنا کہے دیتے ہیں کہ جب ان پوسٹ مین نما شاعر صاحب نے غزلیں ختم کیں تو ہمارے کانوں سے خون بہہ رہا تھا اور کئی دنوں تک ہمارے کانوں میں صرف غزلوں کی گونج سنائی دیتی رہی۔ اب تو ہم نے ان پوسٹ مین نما شاعر سے چھٹکارا پانے کے لئے اپنے اعزا و اقربا اور دوست احباب کو لکھا ہے کہ وہ خط نہ لکھا کریں۔ اگر کسی عزیز کے انتقال کی خبر بھی دینی ہو تو اس کی اطلاع ہمارے کسی دوست کو دے دی جائے کیونکہ ہمیں اپنے عزیز کا بلاعلم و اطلاع مرنا پسند ہے لیکن پوسٹ مین نما شاعر کی غزلیں سُننا پسند نہیں۔ اور کسے معلوم کہ یہی غزلیں ایک دن ہماری موت کا سبب بن جائیں۔

یہ تو پوسٹ مین نما شاعر کی داستان تھی۔ ہم ایک افسانہ نگار پوسٹ مین سے واقف ہیں جن کے یہاں ملک کے سارے رسالوں کا اسٹاک یوں جمع رہتا ہے جیسے یہ واقعی ان ہی کے نام روانہ کئے گئے ہوں۔ جب سے یہ صاحب ہمارے حلقے میں آئے ہیں ہم نے سارے معیاری رسالے منگوانے ترک کر دیئے ہیں۔ کیونکہ معیاری رسالوں کو بذریعہ ڈاک منگوانا ایک معیاری غلطی ہے۔ پھر جب یہ صاحب غیر معیاری رسالے بھی تقسیم کرتے ہیں تو ان کی تقسیم کا انداز بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ ہمارے ہاتھ میں اچھی طرح پیک کیا ہوا رسالہ تھما دیتے ہیں، پھر کہتے ہیں ــ" صاحب! اس میں کرشن چندر کا افسانہ ضرور پڑھئے، فلاں صفحہ پر موجود ہے۔ ظالم نے اتنا خوبصورت افسانہ لکھا ہے کہ میری نیت ڈانواں ڈول ہوتے ہوتے رہ گئی۔ مگر سوچا کہ گزشتہ مہینے بھی راجندر سنگھ بیدی کے افسانے کی وجہ سے آپ کو گزشتہ شمارہ نہیں مل سکا تھا۔ اسی لئے یہ شمارہ بحالتِ مجبوری آپ کو دے رہا ہوں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو یہ شمارہ پڑھنے کے بعد مجھے

دے دیجئے۔" اس پر ہم صرف اپنے دانت پیس کر رہ جاتے ہیں۔ اور ابھی ہم اچھی طرح دانتوں کو پیسنے بھی نہیں پاتے کہ ان صاحب کا ارشاد ہوتا ہے: "ارے ہاں، اس شمارے میں ایک برہنہ تصویر بھی شامل تھی جسے میں نے رسالے سے جدا کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ تصویر اتنی برہنہ تھی کہ آپ کے اخلاق پر بُرا اثر پڑ سکتا تھا۔ یہ تصویر میں نے اپنے پاس رکھ لی ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔"

اور ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں: "بھئی۔ ہمیں اعتراض تو اس بات پر ہے کہ آپ نے سارا رسالہ ہی اپنے پاس کیوں نہ رکھ لیا۔ اب ہم اس بچے کھچے اور پڑھے پڑھائے رسالے کو لے کر کیا کریں گے؟"

پھر ہم اس رسالے کو کھول کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ شدّتِ مطالعہ کے باعث اس کی سطریں تک مٹ چکی ہیں اور اس کے ہر صفحہ کے حاشیئے پر پوسٹ مین صاحب کی رائے کے جنگل بکھرے پڑے ہیں۔

ایسے ہی پوسٹ مینوں کی حرکت کے باعث محکمۂ ڈاک کی وہ تعریف ہمیں نہایت درست معلوم ہوتی ہے جس کے بموجب محکمۂ ڈاک وہ محکمہ ہے جہاں دوسروں کے رسالوں پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔

ہم ضمنی طور پر یہ بھی کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں اکثر رسالے نہیں ملتے۔ مگر وہ رسالے بڑی پابندی سے مل جاتے ہیں جن میں ہمارے افسانہ نگار پوسٹ مین کے افسانے شائع ہوتے ہیں۔ بلکہ ہمیں تو ایسے رسالوں کی دو دو کاپیاں تک ملی ہیں۔ مگر ایسے افسانوں کو پڑھ کر ہم کیا کریں جن میں سارا محکمہ ڈاک ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔ چنانچہ ان افسانہ نگار پوسٹ مین کے افسانے کا ایک پیراگراف ہمیں اب تک یاد ہے جو یوں شروع ہوتا ہے:

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور نجمہ اپنے بچے کو ایک کونے میں ڈھکیل کر یوں پیٹنے لگی جیسے کوئی پوسٹ مین خطوں پر مہریں لگا رہا ہو۔ اس کا بچہ زار و قطار رونے لگا۔ نجمہ کا شوہر خالد دُور کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ نجمہ کے غصہ کے آگے کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ نجمہ بڑے گھر کی بیٹی تھی، اپنے ساتھ جہیز لے آئی تھی۔ بس یوں سمجھئے کہ وہ اس کے گھر "انڈر پوسٹل سرٹیفکٹ" ــــــ آئی تھی۔ خالد کی حیثیت تو ایک "بیرنگ لفافہ" کی سی تھی کہ جو پیسہ دے اس کو وہی حاصل کرے۔ نجمہ کے ہاں گزشتہ مہینے ہی چوتھی ڈلیوری ہوئی تھی۔ خالد ان "اکسپریس ڈلیوریوں" سے تنگ آچکا تھا۔ اس کی ساری خوشیاں اس کے دل کے نہاں خانے میں یوں دبی پڑی تھیں جیسے "ڈیڈ لیٹر آفس" میں خطوط پڑے رہتے ہیں۔ خالد سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ لیٹر بکس کے رنگ کی طرح سرخ ہونے لگا۔ پھر اس نے اپنے حواس درست کئے اور ہمت سے بولا : " نجمہ : اگر تم میرے بچوں کو اسی طرح پیٹتی رہیں تو میں تمہیں تمہارے میکے کو " ری ڈائرکٹ " کر دوں گا۔ "

لیکن ان ساری شکایتوں کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہمیں پوسٹ مینوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ یہ تو صرف مذاق کی باتیں تھیں۔ اگر پوسٹ مین تاخیر سے ڈاک تقسیم کرتا ہے تو کچھ وجہِ تاخیر بھی ہوتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس پوسٹ مین کی حالت پر غور کیا ہے جو لوگوں میں شادیوں کے رقعے بانٹتا ہے مگر خود اس کے گھر میں تین بیٹیاں اس انتظار میں بیٹھی ہیں کہ کوئی آئے اور انھیں ڈولی میں بٹھا کر لے جائے۔ اِس

پوسٹ مین کے صبر و استقلال کی داد دیجئے جو لوگوں کی شادیوں کے رقعے تو بانٹ دیتا ہے مگر وہ خود اپنی بیٹیوں کی شادی کے رقعے بانٹنے کی حسرت سینے میں چھپائے پھر رہا ہے۔ پھر پوسٹ مین کے قبضے میں ہزاروں روپے موجود ہوتے ہیں مگر وہ خود ایک بیڑی تک خرید نہیں سکتا۔ اور جب سمندر سے پیاسے کو شبنم بھی نہیں ملتی تو ہمیں پوسٹ مین سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ لوگوں میں خوشیاں بانٹنے کے لئے اپنی کتنی ہی خوشیاں قربان کر ڈالتا ہے۔ اب اگر وہ چوری چھپے ہمارا رسالہ پڑھ لیتا ہے تو کونسا جرم کرتا ہے۔ وہ صبر و ضبط کا ایک بھاری سل اپنے سینے پر رکھ کر گلی گلی گھومتا ہے، دروازوں پر آوازیں لگاتا ہے ــــ "پوسٹ مین۔ حضور اپنا منی آرڈر لے جائیے" ــــ مگر کوئی اس کے دروازے پر دستک نہیں دیتا۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ "پوسٹ مین صاحب! یہ روپے لے جائیے اور ان سے اپنی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کیجئے"۔ مگر پوسٹ مین کو دوسروں کی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرانے کے کام سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ وہ تو ایک ایسا "بیرنگ لفافہ" ہے جو سماج کے "ڈیڈ لیٹر آفس" میں برسوں سے پڑا اس بات کا منتظر ہے کہ کوئی اس بیرنگ لفافہ کو حاصل کرے، اسے کھولے اور پڑھ کر دیکھے کہ اس لفافہ کا مضمون کتنا الم انگیز اور حسرت انگیز ہے۔ یوں بھی اب وہ لوگ کہاں باقی رہے جو صرف لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں۔

علّامہ نارسا کی وفات مسرّت آیات پر

جب عین عالمِ ضعیفی میں علّامہ نارسا کا انتقال ہوا تو ان کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی اور فائر بریگیڈ کا عملہ صرف منہ دیکھتا رہ گیا۔ علّامہ نارسا کے بال بہت بڑے تھے اسی لئے وہ اردو کے "چوٹی" کے شاعر سمجھے جاتے تھے اور لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ بعض لوگوں نے انھیں ناک اور پیشانی پر بھی بٹھانے کی کوشش کی مگر مرحوم کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ یہ سراسر ان کی کسرِ نفسی تھی۔ علامہ ہر اعتبار سے علّامہ تھے جیسے بنیا ہر اعتبار سے بنیا ہوتا ہے۔ مرحوم میں کئی خوبیاں تھیں جنھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے اور یہیں آکر قدرت کی ستم ظریفی کو کوسنے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے بلا وجہ انسان کو دس انگلیاں

دے رکھی ہیں کیونکہ علامہ کی خوبیوں کو گننے کے لئے دو چار انگلیاں ہی کافی ہوسکتی تھیں یہ قدرت کی فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے۔

علاّمہ کی سب سے بڑی خوبی جو دراصل ایک خرابی تھی وہ یہ تھی کہ وہ شاعری کرتے تھے لیکن مرحوم کی قوتِ ارادی کی داد دینی چاہئے کہ انھوں نے مرتے دم تک شاعری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور نزع کے عالم میں بھی تیمار داروں کو اپنی ایک نامکمل غزل کا مقطع سُناکر مر گئے۔ حق جہنم رسید کرے عجب بور مرد تھا۔ اسے علامہ کی فرض شناسی نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ انھوں نے اپنی ایک غزل بھی نامکمل نہ چھوڑی۔ علامہ نے ۸۰ برس کی عمر پائی اور انھوں نے ۸ ہزار غزلیں کہیں جن پر ۸ لاکھ افراد نے ہوٹنگ کی۔ مگر مرحوم ایسے حوصلہ مند، نڈر اور جری انسان واقع ہوئے تھے کہ اگر ۸ کروڑ افراد نے بھی ہوٹنگ کی ہوتی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ بات دراصل یہ تھی علامہ بڑے ظریف الطبع واقع ہوئے تھے اور ہر سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹال جاتے تھے۔ مثلاً ایک مشاعرے میں جب سامعین نے ان پر انڈے پھینکے تو انھوں نے سارے انڈے ہاتھوں میں جھیل لئے اور گھر جاکر ان انڈوں کی پڈنگ پکوائی، پھر جب دوسری بار مشاعرے میں شرکت کرنے گئے اور لوگوں نے ان پر انڈے نہ پھینکے تو علامہ بپھر گئے اور سامعین سے شکایت کرنے لگے:

"حضرات! اگر آپ لوگوں نے انڈے نہیں پھینکے تو میں غزل نہیں سناؤں گا۔"

اس پر منتظمین مشاعرہ نے فوراً بازار سے انڈے منگوائے اور جب دو چار انڈے پھینکے گئے تو علامہ نے غزل کا سلسلہ شروع کیا جو صبح تک جاری رہا۔ اس کے بعد علامہ نے ایک معمول سا بنا لیا کہ جب بھی کسی مشاعرہ میں جاتے تو لوگوں سے کہتے کہ آج مجھ پر آلو پھینکے جائیں کیونکہ آج آلو کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔" ایک بار تو انھوں نے

یہاں تک کہہ دیا کہ "آج مجھ پر ایک پلیٹ بریانی، ایک پیالی چائے اور سگریٹ کی ڈبیہ پھینکی جائے۔"

علامہ نے بڑی خوددار طبیعت پائی تھی۔ چنانچہ انھیں زندگی بھر اپنے کلام کے سوائے کسی شاعر کا کلام پسند نہ آیا۔ حد تو یہ کہ انھوں نے محض اپنی خودداری کو نبھائے رکھنے کے لئے کسی شاعر کا کلام بھی نہیں پڑھا اور اپنے سوائے کسی اور کے کلام پر داد نہیں دی۔ خودداری کی ایسی مثال ان دنوں مشکل ہی سے ملے گی۔ علامہ نے ۸۰ برس کی عمر میں چار شادیاں کیں اور اپنی شاعری کے جملہ ۴ مجموعے شائع کروائے جن میں سے ہر ایک مجموعہ کو انھوں نے اپنی ایک ایک بیوی کے نام معنون کروایا (خدا کا شکر ہے کہ مرحوم نے پانچ شادیاں نہیں کیں ورنہ پانچ مجموعے منظرِ عام پر آجاتے)۔

پہلے مجموعہ کا انتسابی نوٹ انھوں نے یوں لکھا تھا:

"میں اپنے پہلے مجموعۂ کلام کو بصد نفرت و حقارت اپنی پہلی بیوی کے نام معنون کرتا ہوں۔"

دوسرے مجموعے کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا تھا:

"میرے دوسرے مجموعۂ کلام کے منظرِ عام پر آنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ میری دوسری بیوی کو عرصہ سے شکایت تھی کہ میں نے اپنا مجموعۂ کلام صرف پہلی بیوی کے نام کیوں معنون کیا ہے، اس کے نام کیوں معنون نہیں کیا۔ اس مسئلہ پر میری ہر دو بیویوں میں لڑائی جھگڑا جاری رہتا تھا جس سے میں تنگ آچکا تھا۔ سو میں اپنے گھریلو حالات کو پُرامن بنانے کے لئے دوسرا مجموعۂ کلام شائع کر رہا ہوں۔ اب اگر ضمنی طور پر اس مجموعہ کی اشاعت سے ادب کی خدمت ہوتی ہے تو میں اس کے

لئے معافی کا خواستگار ہوں۔"

ان تیسرے اور چوتھے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے پیچھے بھی علامہ کی ازدواجی زندگی پوشیدہ تھی جو لوگوں کو بہت کم نظر آتی تھی - علامہ ریاضی میں بہت کمزور تھے. چنانچہ انھیں ۲۵ تک گنتی آتی تھی اور وہ بھی اس لئے آتی تھی کہ علامہ کی ۲۵ اولادیں تھیں. ریاضی سے ان کی واقفیت محض ایک مجبوری تھی. عمر کے آخری حصّے میں علامہ کی بینائی اس حد تک خراب ہو چکی تھی کہ ایک بار جب ان کے بڑے لڑکے نے سڑک پر انھیں سلام کیا تو انھوں نے اپنے ہی بیٹے کے سلام کا جواب دینے کے بعد اس سے پوچھا :

" کہو میاں ! تمہارے والد کی صحت کیسی ہے ؟"

اور سعادت مند بیٹا ان کے استفسار کے جواب میں بولا :

" کیا عرض کروں ان دنوں والد بزرگوار کی صحت اچھی نہیں رہتی. بینائی بہت خراب ہو چکی ہے' یہاں تک کہ ہم لوگوں کو بھی نہیں پہچان پاتے۔"

اس پر علاّمہ نے کہا :

" آپ بینائی کی خرابی کی باتیں کرتے ہیں. اگر بینائی اچھی بھی ہو تب بھی میں اپنے بچوں کو نہیں پہچان سکتا۔" پھر بولے " میاں ! ایسے سعادتمند والدین اس دنیا میں کہاں باقی ہیں جو اپنی اولاد کو پہچان سکیں۔"

علامہ کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ انھیں اپنا کلام سُنانے کا عارضہ لاحق تھا. اگر کوئی نئی غزل ہوتی (جو اتفاق سے ہر روز ہو جایا کرتی تھی) تو سارے محلّے کو سُنانے کے لئے نکل کھڑے ہوتے تھے. یہی وجہ تھی کہ جب علامہ گھر سے نکلتے تو سڑکوں پر بھگدڑ مچ جاتی اور لوگ گلیوں میں بھاگ جاتے ، دوکاندار اپنی دکانیں بند کر دیتے اور

اور مائیں اپنے بچوں کو اُٹھا کر سینے سے چمٹا لیتیں ۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے سڑک ویران ہوجایا کرتی تھی ۔ مگر علامہ کا یہ عارضہ اکثر اوقات ملک اور قوم کے لئے بڑا کارگر ثابت ہوتا تھا ۔ مثلاً ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مقامی کالج کے طلبار نے ہڑتال کی اور جلوس نکالا ۔ ایک مقام پر جلوس مشتعل ہوگیا اور پولیس پر سنگ باری کرنے لگا ۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا مگر جلوس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ جب صورتِ حال بہت نازک ہوگئی تو سب انسپکٹر پولیس کے ذہن میں اچانک ایک ترکیب آئی ۔ وہ سیدھے علامہ کے گھر بھاگا اور انھیں اپنے ساتھ لے آیا ۔ ادھر طلبار کی سنگ باری بدستور جاری تھی کہ اچانک مائیکروفون پر اعلان ہوا :

• خواتین وحضرات ! اب آپ علامہ نارسا سے ان کی تازہ غزل سماعت فرمائیے " :

مائیکروفون پر یہ اعلان ہونا تھا کہ طلبار اپنے سر پہ پاؤں اور پاؤں پر سر رکھ کر بھاگنے لگے اور ابھی علامہ نے اپنی غزل کا مطلع ہی سُنایا تھا کہ مطلع صاف ہوگیا ۔ طلبار تو طلبار پولیس کی ساری جمعیت بشمول سب انسپکٹر پولیس مقام حادثہ سے غائب تھی ۔

علامہ کے کشف وکرامات کی یہ ایک معمولی سی مثال ہے ۔ مگر بعض اوقات سُنانے کے اس مرض نے علامہ کو کافی ذلیل وخوار بھی کروایا ۔ مثلاً ایک بار علامہ نے اپنی غزل سُنانے کے لئے ایک راہ چلتے شخص کا اغوا کیا اور اسے ایک ہوٹل میں لے گئے اور چائے کے ساتھ لگاتار دو گھنٹوں تک اسے اپنا کلام پلاتے رہے اور وہ بھی لگاتار دو گھنٹوں تک مختلف اشیائے خوردونوش کھاتا رہا ۔ جب علامہ کی طبیعت سنبھلی تو شخصِ مذکور سے اپنے کلام کے بارے میں رائے پوچھی ۔ اس پر وہ شخص اپنے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے چلّا کر بولا :

• قبلہ ! اگر آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہوں تو براہ کرم اس کاغذ پر لکھ دیجئے کیونکہ میں پیدائشی بہرہ ہوں اور کوئی بات سننے کی اہلیت

نہیں رکھتا۔"

لوگوں کا بیان ہے کہ یہ واحد شخص تھا جسے علاّمہ کی ذات سے فائدہ پہنچا تھا، کیونکہ اور لوگوں کو وہ اپنی غزل سُنائے بغیر کچھ کھلاتے پلاتے نہیں تھے۔ حد تو یہ کہ کسی فقیر کو ایک پیسہ بھی خیرات دیتے تو اسے اپنا ایک شعر ضرور سُنا دیتے۔ اس عادت کا نتیجہ یہ نکلا کہ علامہ کے گھر پر آج تک کسی فقیر کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا گیا۔

علاّمہ کو شاعری کے میدان میں قدم جمانے کے لئے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدا میں جب ان کے ہر شعر پر ہوٹنگ کرنے کو لوگ اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے تو انھوں نے اپنے کلام کو مقبول بنانے کے لئے بعض فقیروں کی خدمات حاصل کیں۔ انھیں اپنا کلام رٹایا اور سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ دیا۔ جہاں وہ علامہ کی غزلیں گا گا کر بھیک مانگتے مگر انھیں دن بھر میں ایک پیسے کی خیرات بھی نہیں ملتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاّمہ کا کلام تو عوام میں مقبول ہو گیا مگر بے چارے فقیروں کا بزنس تباہ و تاراج ہو گیا۔ جب فقیروں نے بھی علامہ کا کلام گانے سے انکار کر دیا تو انھیں ایک نئی ترکیب سوجھی۔ یعنی اب کی بار انھوں نے ایک کاتب کی خدمات حاصل کیں اور اپنی ساری پسندیدہ غزلیں شہر کی دیواروں پر لکھوا دیں۔ جب ان کا سارا کلام شہر کی دیواروں پر "زیورِ طبع" سے آراستہ ہو گیا اور لوگ سفیدی کراتے کراتے عاجز آگئے تو شہریوں کے ایک وفد نے علاّمہ سے ملاقات کی اور ان سے "صلح" کر لی کہ وہ انھیں مشاعروں میں مدعو کیا کریں گے (تاریخ میں اس صلح کو "صلحنامہ شاعر و سامعین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) اس کے بعد سے علامہ ہر مشاعرہ میں جانے لگے اور مشاعروں کو لُوٹ کر اپنے گھر لے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے گھر میں مشاعروں کا انبار لگ گیا۔ علامہ کے کلام کی واحد خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ترنم کے سوائے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اگر ان کے کلام میں سے ترنم کو نکال دیا جائے

تو کلام میں تخلص کے سوائے کچھ بھی باقی نہیں بچ جاتا تھا۔

علامہ نے زندگی بھر میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جو بحر سے خارج نہ ہو۔ ہر مصرعہ دوسرے مصرعہ سے یا تو چھوٹا ہوتا تھا یا بڑا۔ اور جب لوگ ان سے شکایت کرتے کہ غزل کے سارے مصرعے بحر سے خارج ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ دلیل پیش کرتے کہ :

" میاں ! جب انسان کے ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں تو ایک غزل کے دس مصرعے کس طرح برابر ہوسکتے ہیں۔ قدرت کی تخلیق خود بحر سے خارج ہے، خدا نے سب کو یکساں پیدا نہیں کیا ہے "

علامہ کے کلام سُنانے کا انداز بھی بڑا انوکھا اور اچھوتا تھا۔ وہ کلام کیا سناتے تھے، اچھا خاصا ڈرامہ پیش کرتے تھے۔ شعر میں اگر معشوق کی انگڑائی کا تذکرہ ہوتا تو اسٹیج پر ایسی بھرپور انگڑائی لیتے کہ مائیکروفون سمیت چار پانچ شعراء کو اپنی انگڑائی کی زد میں لے لیتے۔

ایک مشاعرہ کا ذکر ہے کہ علامہ نے ایک شعر میں گریباں کے چاک ہونے کا سماں باندھا تھا۔ اس شعر کو پڑھتے ہوئے انھوں نے اداکاری کے وہ جوہر دکھائے کہ آن کی آن میں قمیص کا گریبان چاک کر لیا۔ پھر جب مشاعرہ ختم ہوا تو منتظمین کے پیچھے پڑ گئے کہ انھیں مشاعرہ کے مقررہ معاوضہ کے علاوہ قمیص کی قیمت بھی ادا کی جائے۔ منتظمین نے لاکھ سمجھایا کہ علامہ آپ کا قمیص تو پُرانا تھا، ہم آپ کو نئے قمیص کی قیمت کس طرح ادا کرسکتے ہیں ؟ مگر علامہ نہ مانے اور بالآخر منتظمین کو نئے قمیص کی قیمت ادا کرنی پڑی۔

اس کے بعد علامہ نے ایک معمول سا بنا لیا کہ جس کسی مشاعرہ میں جاتے وہاں گریباں چاک والی غزل سُناتے اور پرانے کے بدلے نیا قمیص لے کر آتے۔ مگر رفتہ رفتہ منتظمین بھی

ہوشیار ہو گئے۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں جب علامہ کلام سُنانے کے لئے پہنچے تو انھوں نے زبردستی علامہ کا قمیص اُتار لیا اور احتیاطاً انھیں پاجامے سے بھی محروم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ کو صرف لنگوٹ پہن کر مائیکروفون پر کلام سُنانا پڑا۔

مگر افسوس کہ علامہ کے کلام سُنانے کا یہی انداز بالآخر ان کی موت کا سبب بنا اور وہ شاعری کی راہ میں شہید ہو گئے۔ ہوا یوں کہ ایک شعر میں "قتل" کا تذکرہ تھا۔ چنانچہ علامہ نے قتل کا سماں باندھنے کے لئے اپنی جیب سے اُسترا نکالا اور آن کی آن میں اسے اپنے گلے پر پھیر لیا۔ علامہ کی نعش اسٹیج پر تڑپنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے علامہ کی رُوح "قفسِ عنصری" کا تالا توڑ کر پرواز کر گئی۔

اب علامہ ہم میں نہیں رہے جس پر جتنی مسرت کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ زندگی بھر علامہ کو بہتیرا سمجھایا گیا کہ علامہ ایسے مہلک اشعار نہ کہیے جن سے آپ کی جان کے لالے پڑ جائیں مگر وہ نہ مانے اور گزشتہ پیر کو شاعری کے میدان میں شعر پڑھتے پڑھتے شہید ہو گئے۔

علامہ کی کس کس بات کا ذکر کیا جائے اور ان کی موت پر کتنے قہقہے لگائے جائیں غرض علامہ کے انتقال سے ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا ہے جسے پُر کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ علامہ بہت موٹے تھے اور اتنا بڑا خلاء تین چار شعراء سے بھی پُر نہیں کیا جا سکتا خدا مرحوم کی رُوح کے ساتھ قرار واقعی سلوک کرے اور ان کے پس ماندگان کو بے صبری عطا کرے ؎

خدا بخشے بہت سی خامیاں تھیں مرنے والے میں

مجھے میرے دھوبی سے بچاؤ!

کل مرزا سے ملاقات ہوئی تو خفا خفا سے نظر آئے۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگے:
"کل میں نے تمہیں عابد روڈ پر کتنی بار پکارا لیکن تم نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ جاؤ میں تم سے بات نہیں کرتا۔" میں بہت پریشان ہوا اور مرزا سے کہنے لگا:
"تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں چار دن سے عابد روڈ نہیں گیا اور تم کہتے ہو کہ تم نے کل مجھے پکارا۔"

مرزا بولے: "بالکل غلط، تم کل عابد روڈ پر تھے، خود میری ان آنکھوں نے تمہیں دیکھا کہ تم اپنے مخصوص بھورے سوٹ میں ملبوس، تیز تیز قدموں سے چلے جا رہے تھے۔"
میں یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ لیکن جب میں نے اس سائنٹفک مسئلہ کا سنجیدگی سے جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ مرزا جس بھورے سوٹ کا ذکر کر رہے ہیں وہ اس وقت دھوبی کے پاس محفوظ ہے۔ مزید سنجیدگی کے ساتھ میں نے غور کیا تو یقینِ کامل ہو گیا کہ

مرزا جسے "میں" سمجھ بیٹھے تھے وہ اصل میں "میں" نہیں تھا بلکہ میرا دھوبی تھا اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ لوگوں نے ہمیشہ میرے دھوبی کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو وہ میرے ساتھ کرتے ہیں۔ ایک بار تو حد ہوگئی کہ میرا بچہ میرے دھوبی کے پیچھے "پپا۔ پپا" کہتا ہوا دوڑ پڑا۔ لیکن جب وہ قریب پہنچا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس کے پپا کے لباس میں اس کے پپا کا دھوبی سامنے کھڑا ہے۔ اس کم بخت کو میں نے کتنی بار سمجھایا کہ میاں تم کپڑے دھونے کے لئے لے جاتے ہو، پہننے کے لئے نہیں ــــ" لیکن وہ میری بات نہیں مانتا اور ہر آٹھ دن بعد مجھ سے کپڑے مانگنے کے لئے آجاتا ہے۔ میرا بس چلے تو میں اس کا خون پی جاؤں لیکن مجبوری ہے۔

اب آپ سے کونسی بات چھپائی جائے، ایک بات ہو تو چھپ بھی سکتی ہے ایک بار یہ ناہنجار خود میرے سامنے میرا سوٹ پہن کر نمودار ہوا اور اس شان سے جلوہ گر ہوا کہ میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہوگیا: اس دن میری خودی کو بے حد ٹھیس پہنچی اور آن کی آن میں اقبال کے سارے فلسفۂ خودی کے اسرار و رموز مجھ پر آشکار ہوگئے کہ اگر انسان اپنی خودی کا لبادہ اُتار ڈالے تو اس کی ہستی نیستی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ میں نہایت پھٹے پُرانے کپڑوں میں ملبوس تھا اور وہ بدتمیز میرے نئے سوٹ میں ملبوس۔ کیا بتاؤں کہ کس قدر غصہ آیا۔ جی میں آئی کہ اس کو سرِ بازار ننگا کر دوں اور اپنے کپڑے لے کر چلتا بنوں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اسے عریاں کر دیتا وہ برابر والی گلی میں بھاگ گیا۔

اسی لئے تو میں لوگوں سے کہتا ہوں، التجا کرتا ہوں کہ خدا کے لئے مجھے میرے دھوبی سے بچایئے۔ اگر وہ پھر کبھی میرا لباس زیب تن کرکے میرے سامنے آجائے تو ہوسکتا ہے کہ میں اسے قتل کر ڈالوں۔ اب میں جامے سے باہر ہوگیا ہوں، مجھ میں

ضبط کا مادہ نہیں رہا۔ اگر پھر کبھی میرا دھوبی میرے سامنے میرا ہی سوٹ پہن کر آجائے تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔

ایک بار تو میں نے غصہ میں سرِ بازار اس کا گلا پکڑ لیا۔ لیکن جب میں نے غصہ میں شرٹ کے کالر کو کھینچنے کی کوشش کی تو وہ گڑگڑاتے ہوا بولا :

" حضور! خیال رہے کہ جس شرٹ کے کالر کو آپ بے دردی کے ساتھ کھینچ رہے ہیں وہ آپ ہی کا شرٹ ہے اور اگر یہ پھٹ جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی "۔

میں نے یہ جملہ سُنا تو میرے ہاتھ کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ گئی اور وہ پھر بھاگ گیا۔

جب بھی میں دھوبی پر حملہ کرنا چاہتا ہوں تو مجھے اپنے ہی کپڑوں کی سلامتی کا خیال آجاتا ہے۔ یہ صورتِ حال ہماری فلموں کے ان مناظر سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ جب ویلن ہیرو کو مارنا چاہتا ہے تو فوراً ہیروئن ہیرو کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور چونکہ ویلن کو ہیروئن سے بھی خواہ مخواہ محبت ہوتی ہے' اس لئے وہ چپ چاپ پستول جیب میں ڈال لیتا ہے۔ اور کہیں بھاگ جاتا ہے۔

جب بھی میں اپنے دھوبی کو اپنے کپڑوں میں ملبوس دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار وہ لطیفہ یاد آجاتا ہے کہ ایک صاحب کسی دوست کے ہاں مہمان بن کر گئے اور دوست کی ساری اشیاء کو بلا تکلف استعمال کرنے لگے۔ ایک دن ان کے دوست نے ان کی حرکتوں کے بارے میں لوگوں سے یہ شکایت کی :

" صاحب! یہ عجیب و غریب آدمی ہیں۔ داڑھی بنانی ہو تو میرا شیونگ سیٹ استعمال کرتے ہیں۔ باہر جانا ہو تو میرے کپڑے استعمال کرتے ہیں۔ مجھے یہ سب چیزیں گوارہ ہیں لیکن دلی صدمہ تو مجھے اس وقت پہنچتا ہے جب یہ پان

چبانے کے لئے میرے مصنوعی دانتوں کا سیٹ استعمال کرتے ہیں اور پان چبانے کے دوران میں میری ذات کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں اور مزید افسوس کی بات تو یہ ہے کہ میرے ہی دانت نکال کر مجھ پر ہنستے ہیں۔ بتائیے یہ کس قدر گھٹیا اور کمینہ حرکت ہے۔

سچ پوچھئے تو میرا دھوبی بھی میرے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے، وہ میرے ہی کپڑے پہن کر میرے سامنے اپنی "جامہ زیبی" کی دھونس دنیا والوں پر جماتا ہے اور میں اپنے آپ کو برہنہ سمجھنے لگتا ہوں۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ ایسی صورت میں کیا آپ کا خون نہیں کھولے گا۔ کیا آپ کا کلیجہ منہ کو نہیں آئے گا۔

میرے دھوبی کی کرشمہ سازیاں یہیں ختم نہیں ہوجاتیں بلکہ وہ وقفہ وقفہ سے ایسی صورت حال ضرور پیدا کردیتا ہے جس سے میرا بلڈ پریشر آسمان سے گفت وشنید کرنے لگتا ہے۔ ایک بار میں اسے اپنے کپڑے دھونے کے لئے دے رہا تھا۔ کالی پتلون اسے دے چکا تو بولا:

"صاحب! آپ نے وہ پیلے رنگ کا شرٹ تو دھونے کے لئے دیا ہی نہیں۔"

میں نے کہا:

"پیلا شرٹ ابھی میلا نہیں ہوا ہے، اسے دے کر کیا کروں؟"

اس پر وہ کچھ سوچ کر بولا:

"صاحب، بات دراصل یہ ہے کہ مجھے کل اپنے ایک عزیز کی شادی میں جانا ہے اور کالے رنگ کی پتلون کے ساتھ پیلا شرٹ ہمیشہ میچ کرتا ہے۔"

میں بولا: "تمہارے عزیز کی شادی سے میرے کالے رنگ کی پتلون اور پیلے شرٹ کے میچ کا کیا تعلق؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا: "صاحب اصل میں یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے

پیچ کرتی ہیں اور آپ ان کے باہمی تعلق کو نہیں سمجھ سکتے۔"

اس کی بات پر میں نے فلسفیانہ انداز میں غور کیا تو پتہ چلا کہ یہ ناہنجار اصل میں اپنے ایک عزیز کی شادی کے موقعہ پر میرے کپڑے پہننا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ یہ نکتہ مجھ پر اس وقت واضح ہوا جب کہ وہ میرا پیلا شرٹ اور کالی پتلون لے کر جا چکا تھا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس کے عزیز کی شادی کس مقام پر ہو رہی تھی ورنہ میں ضرور مقامِ واردات پر پہنچ جاتا اور شادی کو ماتم میں تبدیل کر دیتا۔

پھر اس دھوبی کو خدا جانے کس لئے میرے کپڑوں سے بَیر ہے کہ وہ ہمیشہ میرے کپڑے دوسروں کو دے ڈالتا ہے اور دوسروں کے کپڑے ازراہِ عنایت مجھے دے جاتا ہے ایک بار اس نے میرا ایک قمیص کھو ڈالا اور اس کے بدلے میں مجھے ایک نہایت واہیات قسم کا قمیص دے گیا۔ میں اسے بار بار منع کرتا رہا کہ میں یہ قمیص نہیں پہنوں گا، نہ جانے کس کا ہے۔ خدا کے لئے مجھے میرا قمیص واپس کر دو۔

وہ بولا "صاحب، آپ کا قمیص ضرور کسی دوسرے گھر میں چلا گیا ہے۔ میں اگلی بار اسے ضرور لے آؤں گا۔"

چار و ناچار میں نے یہ قمیص اپنے پاس رکھ لیا اور جب کپڑوں کا اسٹاک ختم ہو گیا تو مجھے مجبوراً اسے پہننا پڑا۔ میں یہ قمیص پہن کر ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ اچانک ایک شخص نے میرا گلا پکڑ لیا اور کہنے لگا:

"چور کہیں کے، اُتارو میرا قمیص، نہیں تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

میں اسے لاکھ سمجھاتا رہا، دھوبی کے حوالے دیتا رہا لیکن اس نے نہ مانا اور مجھے بالآخر تھانے تک چہل قدمی کرنی پڑی۔

کسی منچلے نے دھوبی کی تعریف یوں کی ہے کہ "دھوبی وہ شخص ہوتا ہے جو کپڑے کی

مدد سے پتھر کو توڑنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب بھی میرے کپڑے دھل کر آتے ہیں تو یہ گمان گزرتا ہے کہ ضرور دھوبی نے میرے کپڑوں کی مدد سے کئی پتھر توڑ ڈالے ہیں، تبھی تو نئے قمیص کے کالر منہ پھاڑ دیتے ہیں اور پتلون کے پائنچے جھالر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک پاجامے کے ساتھ تو میرے دھوبی نے بڑا برا سلوک کیا تھا۔ یعنی جب میں نے پاجامے کا بغور جائزہ لیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس پاجامے میں دو پائنچوں کی بجائے صرف ایک پائنچہ موجود ہے۔ میں نے پوچھا: "بھائی، میرے پاجامہ میں ہمیشہ دو پائنچے ہوا کرتے تھے، اب صرف ایک پائنچہ کیوں رہ گیا ہے؟"

وہ بولا: "حضور! فکر نہ کیجئے، اگلی بار آپ کو دوسرا پائنچہ بھی مل جائے گا۔"
لیکن مجھے آج تک دوسرا پائنچہ نہ مل سکا۔

پھر دھوبی کے ہاں سے کپڑے بھی بڑی مشکل سے آتے ہیں۔ اس کے لئے باضابطہ پیرویاں کرنی پڑتی ہیں۔ تب کہیں دھوبی اپنے گدھے کے ساتھ آپ کے درِ غربت پر نمودار ہوتا ہے۔ پھر کپڑوں کے دیر سے دھونے کے ہزاروں بہانے دھوبی نے تراش رکھے ہیں۔ برسات کا موسم ہو تو کہتا ہے کہ بارش بہت ہو رہی ہے۔ گرمی کا موسم ہو تو کہتا ہے کہ حضور گھاٹ پر پانی نہیں ہے۔ ایک بار تو اس نے سردی کے موسم میں دیر سے کپڑے لانے کی وجہ یوں بیان کی کہ:

"صاحب! آپ نے اس بار گرم کپڑے دھونے کے لئے نہیں دیئے۔ اس لئے میں انھیں بروقت نہ دھو سکا۔"

میں نے پوچھا: "کپڑوں کے دیر سے دھلنے کا گرم کپڑوں سے کیا تعلق ہے؟"
وہ بولا: "صاحب، سردی بہت ہے۔ جب تک کوئی گرم کپڑا نہ پہن لوں اس وقت تک کپڑے نہیں دھو سکتا۔ لہٰذا آپ آئندہ سے اس بات کا خیال رکھیں کہ سردی

میں جب بھی کپڑے دھونے کے لئے دیں ان میں گرم کپڑے ضرور شامل ہوں، ورنہ آپ کو کپڑے جلدی نہیں ملیں گے۔"

موسم کا بہانہ تو دھوبی بڑی آسانی سے تلاش کر لیتا ہے لیکن جب اسے یہ آسان بہانہ بھی نہیں ملتا تو وہ اپنے رشتہ داروں کو باری باری سے ہلاک کرنے لگتا ہے۔ کبھی کہتا ہے، میرا باپ مرگیا تھا۔ اور کبھی کہتا ہے میری ماں مرگئی تھی۔ اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اب تک یہ اپنے چار باپوں اور پانچ ماؤں کو ہلاک کر چکا ہے۔ لیکن پولیس اس کے خلاف کچھ نہیں کرتی۔ کبھی موڈ اچھا ہو تو اپنی ساس کو بھی مار دیتا ہے۔ اور اگر کسی دن بیوی سے لڑائی ہو تو اپنی بیوی کو بھی مارنے سے نہیں چوکتا۔ ایک دن میں نے دھوبی سے دست بستہ عرض کی :

" میاں ! تمہارے خاندان میں جب دیکھو کوئی نہ کوئی مرتا رہتا ہے، لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ سب مرجاتے ہیں مگر تم مرنے کا نام نہیں لیتے۔ خدا وہ دن کب لائے گا جب تم مرجاؤ اور تمہارے مرنے کی وجہ سے ہمیں کپڑے دیر سے دھل کر ملیں۔"

ہم طرفدار ہیں غالب کے
سخن فہم نہیں

مضمون شروع کرنے سے پہلے حضرتِ غالب کا ایک شعر خود انہی کی خدمت میں پیش ہے ؎

رکھیو غالب مجھے اِس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یعنی اس شعر میں مضمون نگار، حضرت غالب سے کہہ رہا ہے :

"اے قبلہ حضرت غالب، اس گنہ گار مضمون نگار کو تلخ نوائی کے لئے معاف فرمایئے. کیونکہ مضمون نگار کے دل میں اس وقت درد ہو رہا ہے۔"

اور یہ درد ایسا درد ہے جو حد سے گزر بھی جاتا ہے تو دردہی برقرار رہتا ہے۔ اگر آپ

پوچھیں کہ یہ درد کیوں ہو رہا ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ بس ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے؟ یہ بات ہم سے نہ پوچھئے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک صاحب سے پوچھا گیا کہ قبلہ آپ گفتگو کے دَوران میں جا و بے جا، موقع و بے موقع غالبؔ کو کیوں گھسیٹ لاتے ہیں تو انھوں نے کسی قدر تامل کے بعد کہا تھا: "بس اس لئے کہ غالب نے" دیوانِ غالب" لکھا تھا"۔ مطلب اس کا یہ ہوا کہ اگر حضرت غالبؔ دیوانِ غالبؔ نہ لکھتے بلکہ "کلیاتِ میر" لکھتے تو شاید یہ حضرت غالبؔ کی ذات پر کچھ رحم فرماتے اور یوں انھیں بات بات پر دخل در معقولات کا موقع نہ دیتے۔ آگے چل کر مضمون نگار اس شعر سے ہٹ کر یہ کہتا ہے کہ اس نے غالبؔ کے سخن فہموں کو تلاش کروانے کی بہت کوشش کی۔ (اعلاناتِ گمشدگیٔ سخن فہمانِ غالبؔ بھی اخبارات میں شائع کروائے) لیکن افسوس کہ اسے جگہ جگہ یا تو طرفدارانِ غالبؔ ہی ملے یا پھر دیوانِ غالبؔ کے نسخے نظر آئے۔ اس گنہگار مضمون نگار کی چشمِ گنہگار نے کہ جس پر عینک نہیں چڑھی ہوئی تھی جگہ جگہ غالبؔ کے ایسے ایسے طرفداران دیکھے ہیں جو غالبؔ کے اشعار سے اپنے قلوب کو گرماتے اور خود حضرتِ غالبؔ کی رُوح کو "سرماتے" رہتے ہیں۔

مانا کہ ہمیں غالبؔ سے بہت محبت ہے اور طرفداری اس محبت کا عملی مظاہرہ ہے لیکن ایسی بھی کیا طرفداری کہ حضرت غالبؔ کسی طرف کے بھی نہ رہیں۔ ایک صاحب کو ہم سے بھی بے پناہ محبّت اور عقیدت ہے لیکن جب کبھی وہ فرطِ محبّت میں ہم سے بغل گیر ہوتے ہیں تو آن کی آن میں سینہ کی چوڑائی ۳۲ انچ سے گھٹ کر ۲۵ انچ رہ جاتی ہے۔ سچ پوچھئے تو غالبؔ کے اکثر طرفداروں کی عقیدت بھی اسی قسم کی ہے جو ایک طرف تو سینہ کی چوڑائی کو کم کر دیتی ہے اور دوسری طرف شاعری کا قافیہ تنگ۔ بس یہ مضمون نگار اس مضمون میں غالبؔ کے ان ناعاقبت اندیش طرفداروں کا حال بیان کرنا چاہتا ہے،

جنھیں بہر حال ایک نہ ایک دن غالبؔ کو منہ دکھانا ہے۔ کیونکہ یہ دنیا آخر فانی ہے اور جان بھی ایک دن جانی ہے۔

ایک صاحب سے پوچھا گیا کہ قبلہ! ضروریاتِ زندگی میں کون کون سی اشیاء شامل ہوتی ہیں؟ انھوں نے کہا: "کھانا، کپڑا، مکان، غالبؔ اور دیوانِ غالبؔ ـــ!" صاف ظاہر ہے کہ یہ صاحب غالبؔ کے طرفدار تھے اور اس حد تک طرفدار تھے کہ خود غالبؔ کی ذات کو "دیوانِ غالبؔ" سے جُدا کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔

پھر ہم نے دیکھا کہ ان صاحب نے غالبؔ سے اپنی طرفداری جتانے کے لئے "کلیاتِ میرؔ" پر بھی دیوانِ غالبؔ کا ٹائیٹل چڑھا رکھا ہے۔ اور محض ٹائیٹل کے دھوکے میں میرؔ کے کلام کو بھی غالبؔ کا کلام سمجھتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں قطع کلام کرنے کا کوئی موقعہ عنایت نہیں کرتے۔ کیونکہ ان صاحب کی نظر میں اُردو شاعری نے صرف ایک ہی شاعر پیدا کیا ہے اور وہ ہے غالبؔ۔

ان سے ایک بار پوچھا گیا کہ جناب والا! اُردو کے تین بڑے شعراء کے نام تو بتائیے۔ موصوف نے کہا تھا: "غالبؔ، مرزا غالبؔ اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ۔" اس پر ہم نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ آگے ان کی دال نہ گلے گی، پوچھا کہ: "اب لگے ہاتھوں چوتھے بڑے شاعر کا نام بھی بتائیے تو کہنے لگے "نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالبؔ۔" غرض کہ غالب سے ان کا "تعلقِ خاطر" بھی "غبارِ خاطر" سے کچھ کم نہیں۔

انہی صاحب کا ذکر ہے کہ ایک بار وہ "کلیاتِ میرؔ" میں سے جس پر "دیوانِ غالبؔ" کا ٹائیٹل چڑھا ہوا تھا اپنے تئیں غالبؔ کا کلام پڑھ رہے تھے کہ اچانک کسی شعر پر پھڑک اُٹھے اور کہنے لگے "واہ سبحان اللہ۔ کیا شعر کہا ہے غالبؔ نے۔" ہم نے کہا:

"بھئی۔ ہم بھی تو سنیں کونسا شعر ہے؟"

فرمانے لگے ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس شعر کو سنتے ہی ہماری رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور ہم نے پہلے تو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ٹٹول کر ان کی دکھتی رگ پکڑ لی اور کہا:

"جناب یہ شعر غالبؔ کا نہیں میرؔ کا ہے۔"

یہ سنتے ہی انھوں نے اپنی دکھتی رگ ہمارے ہاتھ سے چھڑالی اور تنک کر بولے:

"بالکل غلط، یہ شعر قطعی بھی میرؔ کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میرؔ صاحب تو روتے روتے سو گئے ہیں۔ بھلا سوتے سوتے وہ کس طرح شعر کہہ سکتے ہیں۔ یہ شعر غالبؔ کا ہے اور ۹۹ فیصدی غالبؔ کا ہے۔"

اس پر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو یہی کیا کم ہے کہ وہ اس شعر میں حضرت میرؔ کو بھی ایک فیصدی کا حصہ دار سمجھتے ہیں۔ اگر وہ یہ بھی نہ سمجھتے تو ہم بھلا ان کا کیا بگاڑ لیتے؟

وہ بات بات پر غالبؔ کا تذکرہ یوں کرتے ہیں جیسے غالبؔ سے ان کی رشتہ داری تھی۔ ان کا تکیۂ کلام ہی یہ ہے کہ "اگر آج غالبؔ زندہ ہوتے تو کیا ہوتا؟" مثلاً کسی مشاعرے میں کوئی بور شاعر کلام سنا رہا ہو تو یہ صاحب فوراً کہیں گے "اگر آج غالبؔ زندہ ہوتے تو کیا ہوتا؟"

ہم ان کی اس ناکام تمنا کے بار بار اظہار سے اس قدر عاجز آ گئے تھے کہ ایک بار جب انھوں نے حسبِ معمول رقت آمیز لہجہ میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ

" اگر آج غالبؔ زندہ ہوتے تو کیا ہوتا ؟ تو ہم نے کہا :

" جناب اگر آج غالبؔ زندہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا کیونکہ ان کی عمر حسابی اعتبار سے لوتے دو سو برس تک پہنچ گئی ہوتی اور ان کے قوئ جو ایک سو سال پہلے ہی کافی مضمحل ہو چکے تھے ، بھاری محاصل کے باعث اور بھی مضمحل ہو جاتے۔ بھلا ایسے میں وہ کیا خاک شاعری کر سکتے تھے ؟ "

ہمارے اس دندان شکن جواب کے بعد انھوں نے اپنے مصنوعی دانتوں کا ایک نیا سیٹ خرید لیا ۔ اور اپنی عادت ترک کر دی۔ لیکن ہمیں ان صاحب سے شکایت ہے کہ جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو غالبؔ کے اشعار سُنائے بغیر نہیں چھوڑتے (مخفی مباد کہ ان میں سے اکثریت حضرت میرؔ کے اشعار کی ہوتی ہے) ۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ وہ اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے تھے اور مالک مکان کی زیادتیوں کا دُکھڑا رو رہے تھے کہ یکبارگی انھوں نے مکان کے در و دیوار کی جانب نظر دوڑائی ۔ اک آہِ سرد کھینچی اور نہایت درد بھرے لہجہ میں غالبؔ کا شعر یوں پڑھنے لگے ؎

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ " مرزا غالبؔ "

ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اس پر ہم نے ان سے کہا : " قبلہ ! اب تو آپ کی جرأت اتنی بڑھ گئی ہے کہ در و دیوار پر بھی مرزا غالبؔ کو اُگانے لگے ۔ خدا کے لئے شعر میں مرزا غالبؔ کی جگہ " سبزہ غالبؔ " کہئے " ۔

بولے " آپ مجھے بہکانے کی کوشش نہ کیجئے ۔ میں خوب جانتا ہوں کہ غالبؔ کا پورا نام " سبزہ غالبؔ " نہیں بلکہ مرزا غالبؔ تھا " ۔ اس استدلال کو سننے کے بعد ہم بڑی دیر تک ان کے گھر کے در و دیوار پر اُگے ہوئے مرزا غالبؔ کو دیکھتے رہے اور ہمیں بار بار غالبؔ ہی کا یہ شعر یاد آتا رہا ؎

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

صاحب موصوف کے غلط شعر پڑھنے کی یہ کوئی واحد مثال نہیں ہے بلکہ ہم سے قسم لے لیجئے اگر انھوں نے کبھی بھی غالبؔ کا صحیح شعر پڑھا ہو ۔ انھیں طوطے اور مینائیں پالنے کا بڑا شوق ہے اور وہ غالبؔ کے ساتھ ساتھ ان پر بھی جان چھڑکتے ہیں ۔ ایک بار بیمار پڑ گئے ۔ کمزوری اتنی بڑھی کہ ہاتھ میں رعشہ آگیا ۔ ایسے میں انھوں نے نوکر کو آواز دی ۔ اور کہنے لگے :

" میاں ! میرے محبوب طوطے اور مینا کے پنجروں کو میرے سامنے لا کر رکھ دو "
اور پھر شعر پڑھنے لگے ؎

" گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی " طوطا و مینا " مرے آگے "

ایک بار انھوں نے غالبؔ کا شعر یوں پڑھا تھا ؎

" گدھا سمجھ کے وہ چپ تھا کہ مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے "

اس پر ہم نے کہا کہ " جناب " گدا " کی جگہ " گدھا " پڑھ کر آپ نے جو خود تنقید فرمائی ہے اس کا کوئی جواب نہیں اور سچ پوچھئے تو ان کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا جب انھوں نے غالبؔ کے شعر کو اس کے صحیح معنی و مفہوم کے ساتھ پڑھا تھا ۔

غلط شعر پڑھنے کی بات تو چھوڑیئے وہ غالبؔ کے اشعار کی تشریح پر اُتر آتے ہیں تو غالبؔ کے پرزے اُڑا دیتے ہیں اور غالبؔ نے غالباً انہی کے بارے میں کہا تھا ؎

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

لیکن افسوس کہ جب تماشا ہو رہا ہے تو غالب ہم میں موجود نہیں ہیں۔ ایک بار انھوں نے غالب کا یہ مشہور شعر پڑھا ؎

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

اور پھر اس کی تشریح یوں فرمانے لگے۔ حضرت غالبؔ فرماتے ہیں کہ ان کے معشوق کا شیوہ دھول دھپّا ہرگز نہیں تھا لیکن ایک دن ان ہی سے یہ غلطی ہوگئی کہ انھوں نے اپنے معشوق کی خدمت میں ایک دستی بطور تحفہ پیش کر دی۔ اس پر معشوق کو بڑا غصہ آیا اور اس نے اس دستی کی آڑ میں "دراز دستی" شروع کر دی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ع

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

اسی طرح اور بھی بہت سے اشعار ہیں جن کی تشریح وہ کرتے ہیں تو کلامِ غالبؔ کا جغرافیہ اپنے سارے محل وقوع کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ مرزا غالبؔ جب دلّی کے اِروِن ہسپتال میں زیرِ علاج تھے تو انھوں نے دواخانہ کی بدانتظامیوں کے خلاف یہ شعر کہا تھا ؎

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی   مرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

پھر کہنے لگے یہاں ابنِ مریم سے مراد ایسے "ڈاکٹر" ہیں جو ولایت جا کر بھاری بھرکم ڈگریاں لے آتے ہیں۔ اس کے بعد کہنے لگے ـــ تو مرزا غالبؔ فرماتے ہیں کہ صاحب، آپ ہوں گے ابنِ مریم اپنی جگہ، بڑی بڑی ڈگریاں بھی ہوں گی آپ کے پاس لیکن ان ڈگریوں کا آخر کیا فائدہ؟ جب تک کوئی مرے دکھ کی دوا نہ کرے ـــ مگر جب ڈاکٹروں کو

یہ شعر سُنا چکے تو اردن ہاسپٹل کے ہوشیار اور چالاک ڈاکٹروں نے غالب کو خود ان کا ہی ایک شعر سُنایا ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اس پر غالب بہت شرمندہ ہوئے اور فوراً ڈاکٹروں کو "فیسِ مشورہ" ادا کر دی۔ پھر وہ عمر بھر مرنے کی آرزو میں جیتے رہے۔

ان صاحب کا ذکر تو چھوڑیئے، اب ایک اور طرفدارِ غالب کا حال سُنیئے، جنھوں نے غالب کو اپنا خاندانی شاعر سمجھ رکھا ہے۔ یعنی بیوی سے لے کر بچّوں تک بات بات پر غالب کے پُرزے اُڑاتے رہتے ہیں۔ روزمرہ میں غالب کا استعمال جتنا ان کے گھر میں ہوتا ہے شاید ہی کسی اور گھر میں ہوتا ہو۔ مثال کے طور پر روزانہ صبح جب ان کی بیوی اپنے نوکر کو سودا سلف لانے کی ہدایت دیتی ہیں تو فرماتی ہیں :

> " ارے اسلم! بازار سے جا کر آدھ سیر پیاز، پاؤ سیر ہلدی، ایک چھٹانک مرچ، دو سیر نمک اور ایک عدد دیوانِ غالب لانا۔ اور ہاں دیکھیو امتیاز علی عرشی والا دیوان لانا۔ مالک رام والا لاؤ گے تو میں واپس کر دوں گی۔"

اگر آپ وجہ پوچھیں کہ انھیں دیوانِ غالب کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے، تو جواب اس کا یہ ہے کہ یہ صاحب کتب فروش ہیں اور ان کی دکان پر ہر روز کم از کم دیوانِ غالب کا ایک نسخہ تو ضرور فروخت ہو جاتا ہے۔ کتب فروش ہونے کے ناطے ان صاحب کو ادب سے ایسا ہی لگاؤ ہے جیسے مینڈکی کو زکام سے

ہوتا ہے۔ جب دیکھئے ادب کے کسی نہ کسی گھسے پٹے اور پیٹے پٹائے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے رہتے ہیں۔ نہ جانے کس ڈاکٹر نے انھیں مشورہ دے رکھا ہے کہ ادب کا تنقیدی جائزہ لینا اور غالب کی مٹی پلید کرنا ان کی صحت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ایک بار جگر کی شاعری پر بحث ہو رہی تھی کہ اچانک ہمارے دوست بپھر گئے اور کہنے لگے کہ:

"صاحب! میں تو جگر کو شاعر ہی نہیں مانتا بھئی جو شخص مرادآباد میں پیدا ہوا ہو وہ کیا خاک شاعری کرے گا۔"

ہم نے ان کی لے دے کی تو بولے:

"جناب! جگر کے بارے میں میرا یہ ذاتی نظریہ نہیں بلکہ خود مرزا غالب بھی جگر سے بڑے نالاں تھے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

" ؎ حیراں ہوں روؤں دل کو کہ پیٹوں جگر کو میں

قبل اس کے کہ ہم ان کی گوشمالی کرتے، ایک اور صاحب بحث میں ٹپک پڑے اور کہنے لگے کہ "قبلہ میں جگر کے بارے میں غالب کی رائے کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ ہر شاعر دوسرے شاعر کی برائی کرتا ہے۔"

اس پر ہمارے دوست بپھر کر بولے:

" یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب نے کسی شاعر کے بارے میں جانبداری یا تنگ نظری سے کام نہیں لیا۔ حد تو یہ کہ یگانہ چنگیزی غالب کی شاعری کے شدید مخالف تھے لیکن یہ تو غالب ہی کی صاف دلی تھی کہ اس مخالفت کے باوجود انھوں نے ہمیشہ یگانہ کی تعریف ہی کی۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

نہ جانے بحث کب تک چلتی رہی، ہم تو خیر وہاں سے اُٹھ گئے۔

ایک روز تو ان کتب فروش صاحب نے کمال ہی کر دیا۔ جب ایک صاحب نے ان سے غالب کی کوئی غزل سنانے کی خواہش کی تو کہنے لگے "غالب کی ایک عدد تازہ غزل ہوئی ہے، کہیئے تو سناؤں"۔ پھر غالب کے تخلصِ ثانی کو بطورِ ردیف استعمال کر کے غالب کی غزل یوں سنانے لگے ؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
دل دیا جان کے کیوں اسکو وفادار اسد
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد

غالب سے ان کی طرفداری اور سخن نافہمی کے یوں تو بہت سے قصے مشہور ہیں لیکن چلتے چلتے ہم ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ ایک جگہ محفلِ موسیقی بپا تھی۔ ہمارے کتب فروش دوست بھی وہاں موجود تھے۔ اتفاق سے قوال اس وقت حضرتِ داغ کی وہ مشہور غزل گا رہا تھا جس کا ایک شعر ہے ؎

میرا طریقِ عشق جُدا ہے جہان سے
چلتا ہوں چھوڑ چھوڑ کے ہر رہ گزر کو میں

غزل ختم ہوئی تو یہ صاحب ہماری طرف پلٹے اور بولے: "اس ساری غزل میں ہمیں صرف ایک ہی شعر پسند آیا اور وہ ہے ۔

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

یہ صاحب ایسے ہیں جنھیں ہر وہ بات "خوشگوار" گزرتی ہے جس کا سارے فسانہ میں کہیں ذکر نہیں ہوتا۔

سب سے آخر میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غالبؔ کی طرفداری صرف چند اصحاب نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہماری فلم انڈسٹری بھی اس طرفداری میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ اور اس طرفداری کے ذریعہ غالبؔ کی ذات پر بڑا احسان کر رہی ہے اور یہ احسان بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک صاحب نے سہگل کی آواز میں غالبؔ کی غزل سننے کے بعد کہا تھا: "بھئی سہگل نے تو غالب کی غزل گا کر غالبؔ کو امر کر دیا ہے۔!"

نہ جانے غالبؔ کی کونسی بدی آڑے آگئی کہ وہ فلم پروڈیوسروں کے ہتھے چڑھ گئے۔ سچ پوچھئے تو ہماری فلم انڈسٹری نے غالبؔ کے ساتھ وہ سلوک کیا ہے کہ کوئی شاعر اپنے سامعین کے ساتھ بھی کیا کرے!

آپ نے فلم "مرزا غالب" تو ضرور دیکھی ہوگی جس میں مرزا غالبؔ کو بالکل بھارت بھوشن کی طرح دکھایا گیا ہے۔ بس یوں معلوم ہوتا ہے کہ بھارت بھوشن کو غالبؔ کی داڑھی اور مونچھیں لگا دی گئی ہیں۔ غالبؔ فلمی اداکاروں کی طرح سینہ پر

ہاتھ رکھ کر مکالمے ادا کرتے ہیں اور اپنا کلام بھی "پلمبت لَے" میں گا کر سناتے ہیں۔ طبلہ پر کوئی اور شاگرد سنگت کر رہا ہوتا ہے اور ان کا کوئی ہمعصر شاعر پیانو بجا رہا ہے۔

ہمیں یاد ہے کہ اس فلم کو دیکھنے کے بعد ایک تماشائی نے سینما ہال سے باہر نکلتے ہوئے کہا تھا:

"بھائی۔ غالبؔ ویسے تو شاعر تھے لیکن اداکاری میں بھی ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیا غضب کی ایکٹنگ کی ہے ظالم نے ــــ پتہ نہیں غالبؔ نے اداکاری جیسے پیئنگ پروفیشن کو چھوڑتے ہوئے شاعری جیسا مفلس پیشہ کیوں اختیار کیا تھا ـــ؟"

اس پر دوسرے تماشائی نے کہا:

"اور ایک بات تو تم نے محسوس ہی نہیں کی۔ غالبؔ کی آواز بھی بہت اچھی تھی، بلکہ میں تو کہوں گا کہ غالبؔ کی آواز طلعت محمود کی آواز سے بہت ملتی جلتی تھی۔ کئی گانوں پر تو مجھے شبہ ہوا کہ کہیں طلعت محمود تو نہیں گا رہا ہے؟"

اس پر تیسرے تماشائی نے آہِ سرد بھرتے ہوئے کہا:

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا کہ وہ کبھی ایک پیشہ کا پابند نہیں رہا لیکن یار مجھے یہ شکایت ہے کہ غالبؔ نے اس فلم میں اپنی ساری پرانی غزلیں ریپیٹ کی ہیں۔ اگر غالبؔ کوئی نئی غزل نہیں لکھ سکتے تھے تو کیا وہ شکیل بدایونی سے کہہ کر دو چار غزلیں نہیں لکھوا سکتے تھے ـــ؟"

قصہ مختصر ــــــ

غالب کے طرفداروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ گلی گلی، سڑک سڑک، مکان مکان، جنگل جنگل، صحرا صحرا غالب کے طرفدار بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن افسوس کہ گلی کے کسی نکڑ پر سڑک کے کسی فٹ پاتھ پر، مکان کے کسی گوشے میں، جنگل کے کسی درخت پر اور صحرا کے کسی نخلستان میں غالب کا کوئی سخن فہم نہیں ملتا اور ہم چار و ناچار غالب کے ان طرفداروں کی طرفداری کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہ جو غالب نے کہا تھا تو ٹھیک ہی کہا تھا ؎

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

قصّہ پہلے گریجویٹ درویش کا

اے بزرگانِ ذی احترام، خواتینِ خوش خرام، نوجوانانِ بدکلام وطفلانِ بے لگام، راوی اس جھوٹے قصے کا یوں بیان کرتا ہے کہ کسی زمانے میں ایک شہر آباد تھا کہ جس کے کھنڈر اس کے شاندار مستقبل کی جھوٹی گواہی دیتے تھے اور چونکہ باشندے یہاں کے بہت خوش حال تھے یعنی غربت سے مالامال تھے۔ اسی لئے اس شہر میں عوام کی تفریح کے لئے ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا ایک دفتر بھی قائم تھا جہاں بڑے بڑے نامی گرامی تعلیم یافتہ نوجوان اپنے اسم ہائے گرامی درج کروانے آتے اور اوقاتِ فرصت میں اس دفتر کے احاطے میں بیٹھ کر خوش گپیوں اور کبھی کبھار "رنج گپیوں" میں مصروف رہتے تھے۔ جب بھی کوئی ناعاقبت اندیش نوجوان یونیورسٹی میں علم کی پیاس بجھا لیتا تو وہ اپنی بھوک مٹانے کے لئے اس دفتر کا رُخ کرتا اور برسوں اس دفتر سے واپس نہ لوٹتا۔

سو اس قصہ کا راوی غیر معتبر پیچھے ہٹ کر یوں بیان کرتا ہے کہ ایک دن اس دفتر کے احاطہ میں کہ جس کا قطر ۲۵ میل تھا چار گریجویٹ درویش اپنے ایمپلائمنٹ کارڈوں کی پانچ سو چھٹی مرتبہ تجدید کروانے آئے لیکن دفتر کے کھلنے میں ابھی بہت دیر تھی، یعنی ہر طرف اندھیر تھی۔ اسی لئے ان چاروں درویشوں نے جو شدتِ غم سے نڈھال تھے مگر شجاعت میں بے مثال تھے یہ طے کیا کہ ہر نوجوان اپنی زندگی کا قصہ بیان کرے اور یوں اپنا غم "صحیح" کرے۔

صاحبو! یہ قصہ بہت طولانی ہے اور جان بھی ایک دن جانی ہے پس اے صاحبان اپنی عینکوں کے شیشوں کو صاف کیجئے اور اس قصہ کو غور سے سنئے اور اگر ہوسکے تو ایک دوسرے کے کلیجے بھی تھام لیجئے۔

پھر پہلے گریجویٹ درویش نے کہ جس کی ایک آنکھ سے آنسوؤں کا سیلاب مسلسل بہہ رہا تھا دوسرے درویش کی ٹیڈی پتلون کی جیب سے ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی نکالی اور اپنے بالوں کو سلیقے سے جمانے کے بعد ایک ایسی زوردار مصنوعی آہ کھینچی کہ اس کی شدت سے اس کے بال پھر بکھر گئے۔ پہلے گریجویٹ نے دوسرے گریجویٹ کو کنگھی واپس کی، پھر تیسرے گریجویٹ کی پتلون کی جانب متوجہ ہوا اور بولا:

" اے میرے پیارے بھائی! قبل اس کے کہ میں اپنی داستان سناؤں مجھے ایک سگریٹ پلا کہ میں نے تین دن سے ایک سگریٹ بھی نہیں پی ہے۔"

اس پر تیسرا گریجویٹ رونی صورت بناتے ہوئے بولا " پیارے رفیق، تو نے صرف تین دن سے سگریٹ نہیں پی ہے مگر میں نے تو ایک ہفتہ سے سگریٹ کی شکل تک نہیں دیکھی لہذا مجبوری ہے، پس اپنی داستان سگریٹ کے بغیر ہی سنائیو" یہ سن کر پہلے

گریجویٹ کی دوسری آنکھ سے بھی آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ اس نے اپنے حواس درست کئے اور بولا: " اے میرے درویش بھائیو! تب تو کوئی فکر کی بات نہیں. میں سگریٹ کے بغیر ہی اپنی داستان سناؤں گا، تو صاحبو کان کھول کر سن لو کہ :

" یہ حقیر فقیر کہ نام جس کا لیس ا ے غلام بخت، قسمت جس کی کم بخت اور عقل جس کی محتاج بخت ہے، رہنے والا ملک دکن کا ہے جہاں کی ہر شئے نرالی ہے، جہاں کا ہر شخص موالی ہے اور جس کا محبوب مشغلہ قوالی ہے "

پہلے درویش نے اپنی داستان یہیں تک سنائی تھی کہ چوتھے گریجویٹ نے جو بظاہر ادب کا گریجویٹ معلوم ہوتا تھا مگر بباطن نان میٹرک نظر آتا تھا اُٹھ کھڑا ہوا اور جھاڑو سے اپنے کپڑے جھاڑ کر بولا: " ارے میرے منہ بولے بھائی، تمہاری داستان کا آغاز ہی غلط ہوا ہے، کیونکہ صدیوں سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ جب بھی کوئی درویش اپنی داستان سناتا ہے تو وہ اپنی داستان سے پہلے ایک غیر متعلق شعر بھی سنا دیتا ہے پس تو بھی ایک شعر سنا اور اپنے آباء واجداد کی بھٹکی ہوئی روحوں کو باغ باغ کر دے۔"

پہلا گریجویٹ بولا: " اے ادب کی ویران خانقاہ کے مجاور، مجھے یونیورسٹی سے نکلے ہوئے چھ سال ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اب مجھے اپنے ایمپلائمنٹ کارڈ کے نمبر کے سوا کوئی شعر یاد نہیں ہے۔ پھر بھی تیری خواہش کی تکمیل کروں گا۔" یہ کہہ کر پہلا گریجویٹ سوچ میں اتنا غرق ہو گیا کہ ڈوبتے ڈوبتے بچا اور جب اُبھرا تو بولا: " لو صاحبو مجھے شعر یاد آگیا ہے، نہ جانے کس افسانہ نگار کا ہے ؎

ہزاروں سال نمی اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس شعر کو سُن کر ادب کا گریجویٹ پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا :

" اے برادرِ خورد، اپنی زبان سنبھال اور شعر کو غلط نہ پڑھ ۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال کا ہے اور اس شعر میں تو جہاں اداکارہ نمی کا ذکر کر رہا ہے وہاں پدما شری نرگس کا ذکر ہونا چاہیے ۔"

پہلا گریجویٹ بولا : " اے ادب کے بے ادب گریجویٹ تو ہمارے نقارخانے میں اپنے طوطی کو بار بار بولنے پر کیوں مجبور کرتا ہے ۔ میں نہیں جانتا کہ شعر میں نمی کا ذکر ہے یا پدما شری نرگس کا ۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اُستادِ محترم تو یہاں بیگم پارہ پڑھایا کرتے تھے ۔"

اس استدلال کو سُن کر اَدب کے گریجویٹ کو اتنا غصہ آیا کہ وہ لیڈر کی طرح رنگ بدلنے لگا ۔ پھر وہ پہلے گریجویٹ پر حملہ آور ہونا ہی چاہتا تھا کہ تیسرے درویش نے مداخلت کی اور بولا : " بھائیو ! میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس شعر میں نمی اور نرگس دونوں کا ذکر موزوں معلوم ہوتا ہے ۔ کیونکہ نمی اور نرگس دونوں بھی ایک ہی کیالیبر کی اداکارائیں ہیں ۔ اس طرح شعر کی معنویت اور اس کی نزاکت کو ٹھیس پہنچنے کا کوئی خدشہ نہیں ہے ۔ پس اے پہلے گریجویٹ، اپنے قصہ پارینہ کو جاری رکھ ۔"

پہلا گریجویٹ سنبھلا اور بولا : " تو صاحبو ! یہ حقیر فقیر پُرتقصیر جو ستم ہائے روزگار کا مارا ہوا ، کرم ہائے بے روزگاری کا ستایا ہوا ، یونیورسٹی سے نکالا ہوا ، کالج کی نازنینوں کا نچایا ہوا ، والدین کا دھتکارا ہوا ، رہنے والا ملکِ دکن کا ہے جہاں کا مشہور میوہ املی ہے ۔ صاحبو ! میرا جنم ایک تحصیل دار کے گھرانے میں ہوا ۔ پس مجھے وہ ساری سہولتیں حاصل تھیں جو دیگر تحصیل داروں کے بیٹوں کو حاصل تھیں ۔ میری ابتدائی تعلیم جو اتفاق سے آخری تعلیم بھی تھی گھر پر ہوئی وہ گھر کرایہ کا تھا اور قلبِ شہر میں واقع تھا جس کے حدودِ اربع یہ تھے کہ اس کے شمال میں ایک ہوٹل تھا ، اس کے جنوب میں ایک چائے خانہ ، اس کے مشرق میں ایک

رسٹورنٹ اور اس کے مغرب میں گلنار کیفے واقع تھا۔ غرض ہوٹلوں نے نام بدل بدل کر ہمارے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ دوستو، وہ بھی عجیب دن تھے کہ جب ہر صبح مرغانِ خوش الحان ریڈیو سے فلمی نغمے سُنایا کرتے تھے۔ اور کانوں میں گنّے کا رس گھولا کرتے تھے۔ قصہ مختصر میں نے جب ہوش سنبھالا تو میرے والد کے ہوش ٹھکانے لگ گئے اور انھیں میری تعلیم کی فکر ہوئی۔ مگر افسوس کہ میرے والد نے خود اپنی تعلیم کی فکر کبھی نہیں کی، کیونکہ والد میرے مڈل کامیاب تھے۔ خیر میری تعلیم شروع ہوئی اور گھر پر اُستادوں کا تانتا بندھ گیا۔ تاریخ کے اُستاد، اُردو کے اُستاد، ریاضی کے اُستاد، جغرافیہ کے اُستاد، گوشمالی کرنے کے اُستاد، مرغا بنانے کے اُستاد، کھانا پکانے کے اُستاد، سودا سلف لانے کے اُستاد، وغیرہ وغیرہ۔

اُستادوں کی اتنی افراط تھی کہ میں تو کرسی پر بیٹھا رہتا اور بے چارے اُستاد میرے سامنے بنچوں پر کھڑے رہتے۔ ان تمام اُستادوں کا بیک وقت احترام کرنا مشکل تھا لہٰذا میں صرف ریاضی کے اُستاد کا احترام کرتا تھا اور بقیہ سارے اُستادوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ریاضی کے اُستاد کا احترام مجھ پر اس لئے بھی لازم تھا کہ ریاضی میری سب سے بڑی کمزوری تھی۔ تو صاحبو! ان دنوں میری حالت اس مرغی کی سی تھی جو دو ملاؤں کی لڑائی کے درمیان موقع پاکر فرار ہوجاتی ہے۔ میں پڑھتا رہا اور میرا غم بڑھتا رہا۔ میں صبح دوگنی اور دوپہر چوگنی زوال کی منزلیں طے کرتا رہا۔ حساب میں جس کا تخلص ریاضی ہے اتنی بار فیل ہوا کہ جس کا حساب نہیں۔ اُردو چونکہ میری مادری زبان تھی اور چونکہ میں اپنی والدہ کا احترام نہیں کرتا تھا اس لئے مجھ سے جگہ جگہ املا کی غلطیاں سرزد ہوجایا کرتی تھیں۔ والد میرے اس زوال کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے کیونکہ میں انہی کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ بالآخر مجھے ایک سرکاری مدرسہ میں داخل کروایا گیا۔ سرکاری مدرسہ میں داخل ہونا تھا کہ میری صلاحیتیں اچانک اُجاگر

ہونے لگیں اور میں کھیل کود، سیر سپاٹوں اور شرارتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا، اور چوری چھپے داخلِ درنصاب فلمیں جیسے سکندرِ اعظم، راجہ ہریش چندر اور شکنتلا دیکھنے لگا۔ میں نے میٹرک کے امتحان میں جو گُل کھلائے وہ دنیا کے کسی باغ میں دستیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ مثلاً تاریخ کے پرچے میں نے سکندرِ اعظم اور راجہ پورس کی لڑائی کا حال یوں لکھا تھا کہ:

"سکندرِ اعظم جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس وقت تک پانی پت کا میدان تیار نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے سکندرِ اعظم اور راجہ پورس کو مجبوراً یہ لڑائی دریائے جہلم کے کنارے لڑنی پڑی۔ یوں تو لڑائی میں دونوں بادشاہوں کے سپاہی حصہ لے رہے تھے لیکن لڑائی میں بار بار سکندرِ اعظم اور راجہ پورس ہی نمایاں نظر آتے تھے۔ ایک مرحلہ پر سکندر نے میان سے تلوار نکالی اور پورس پر حملہ آور ہوا لیکن پورس نے ڈھال کی مدد سے سکندر کے وار کو بیکار کر دیا۔ اور بڑی تمکنت کے ساتھ بولا: "اے سکندرِ اعظم! اپنی جان کی خیر منا اور اسی وقت اپنی فوجوں کو لے کر واپس چلا جا ورنہ تو اپنی لاش خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر یہاں سے واپس جائے گا۔" سکندرِ اعظم مسکرایا اور پرے ہٹ گیا، اس نے پینترا بدلا اور پورس پہ دوبارہ حملہ آور ہوا لیکن یہ وار بھی پروگرام کے مطابق خالی گیا۔ اب سکندرِ اعظم کی آنکھوں سے آگ کے شعلے برسنے لگے، اس کے چہرے پر خون سمٹ آیا، اس کے دانت بجنے لگے، اس نے پھر تلوار اٹھائی اور پورس پر حملہ آور ہوا ہی چاہتا تھا کہ اچانک پیچھے سے آوازیں آنے لگیں "چائے گرم، چائے گرم، سوڈا لیمن پان بیڑی سگریٹ"۔ لوگ کرسیوں پر سے اٹھ کر باہر جانے لگے، ہم لوگ بھی انٹرول میں سگریٹ پینے کے لئے باہر چلے گئے۔ واپس ہوئے تو دیکھا کہ

راجہ پورس کو گرفتار کر کے سکندر اعظم کے حضور میں پیش کیا گیا ہے ۔
اس کا مطلب یہ تھا کہ سکندر اعظم نے ہمارے غیاب سے فائدہ اُٹھا کر
راجہ پورس پر فتح حاصل کر لی تھی ۔ لوگ سکندر اعظم کو بڑا بادشاہ مانتے
ہوں تو شوق سے مانیں لیکن میں یہ کہوں گا کہ سکندر اعظم لاکھ اعظم سہی،
اُسے اداکاری مطلق نہیں آتی تھی ۔"

میرے درویش بھائیو! میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں کئی کارنامے انجام دیے
اور اگر میں ان کارناموں کو تفصیل سے بیان کروں تو شاید تمہاری دوروزہ زندگی ختم ہو جائے
اور تم لوگ میرا قصہ سننے کے بعد گھروں کی طرف جانے کی بجائے سیدھے قبرستان کا رُخ کرو ۔
ایک بار تاریخ کے اُستاد نے مجھ سے پوچھا : " بتاؤ فرانس میں کتنے لوئی گزرے ہیں ؟" اس پر
میں گننے لگا کہ لوئی اول، لوئی دوم، لوئی سوم، لوئی چہارم، لوئی پنجم، لوئی ششم، لوئی ہفتم،
لوئی ہشتم، لوئی نہم، لوئی دہم، لوئی میٹرک، لوئی بی اے (جونئر) اور لوئی بی اے (فائنل) .
خوش قسمتی سے ہمارے تاریخ کے اُستاد اتنے رحمدل تھے کہ جہانگیر بادشاہ بھی اتنا رحمدل
نہ رہا ہوگا ۔ لہٰذا وہ ازراہِ رحم دلی بچوں کو زدوکوب کرنے کی بجائے خود اپنا سر پیٹ لیا کرتے
تھے ۔ چنانچہ انھوں نے میرے جواب کو سُن کر مجھے پیٹنے کی بجائے اپنا سر پیٹ لیا اور بولے
" بیٹا، تو فرانس کے لوئیوں کو غلط گن رہا ہے، دماغ پر بار ڈال، کیونکہ
لوئی دہم کے بعد لوئی میٹرک نے حکمرانی نہیں کی تھی ؟

اس پر میں نے دماغ پر زور ڈالا اور لوئیاں فرانس کو پھر یوں گننے لگا : " لوئی اول، لوئی دوم
لوئی سوم، لوئی چہارم، لوئی پنجم، لوئی ششم، لوئی ہفتم، لوئی ہشتم، لوئی نہم، لوئی دہم،
لوئی چہلم :

استاد نے پھر سر پیٹ لیا اور بولے : " بیٹا لوئی دہم کے بعد کوئی چہلم کس طرح آسکتا ہے ؟"

میں بولا : "کیوں نہیں آسکتا جبکہ ہمارے دادا کے انتقال پر دہم کے بعد ان کا چہلم ہی ہوا تھا۔"

تاریخ کے ایک اور پرچے میں میں نے شاہجہان کی فنِ تعمیر سے دلچسپی کا حال یوں لکھا تھا :

"شاہجہان کو فنِ تعمیر سے بہت دلچسپی تھی ۔ اسے جب بھی موقع ملتا، پھاوڑا اور تھاپی لے کر عمارتیں تعمیر کرنے لگ جاتا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ملک میں اتنی عمارتیں نمودار ہوئیں کہ ان میں رہنے کے لئے لوگوں کو تلاش کرنا پڑتا تھا، ان کی منت سماجت کرنی پڑتی تھی ۔جب کوششِ بسیار کے بعد بھی عمارتوں کے لئے مکین فراہم نہ ہوسکے تو بادشاہ نے حکم دیا کہ ان عمارتوں میں مُردوں کو دفن کر دیا جائے تاکہ ان عمارتوں کو بنانے کا مقصد پورا ہو چنانچہ خود بادشاہ بھی اپنے حکم کی تعمیل میں ایک عمارت میں دفن ہوا جوالے کے لئے ملاحظہ ہو تاج محل جو آگرہ میں ہے ۔ بادشاہ نے جب خوب سیر ہو کر عمارتیں تعمیر کرلیں تو وہ فنِ تعمیر کے دیگر شعبوں کی جانب متوجہ ہوا ۔ چنانچہ اس نے بڑے بڑے پہاڑ بنوائے اور وسیع و کشادہ دریا کھدوائے ۔ ہمالیہ پہاڑ شاہجہان ہی نے بنوایا تھا ۔ ایک سمندر بھی بنوایا تھا جسے تاریخ میں بحرِ ہند کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔اس سمندر کو تعمیر کرنے کے بعد بادشاہ بہت پریشان ہوا ، کیونکہ اس میں پانی نہیں تھا لہٰذا اس نے رعایا کو حکم دیا کہ وہ خلیجِ بنگال کا پانی بالٹیوں میں بھر کر بحرِ ہند میں ڈالے چنانچہ لگاتار دس برس تک بحرِ ہند میں پانی ڈالا گیا ۔ دوسرے سمندروں کی مچھلیاں اور وھیل مچھلیاں پکڑ پکڑ کر اس سمندر میں چھوڑ دی گئیں ، تب

کہیں جاکر یہ سمندر تعمیر ہوا "۔

پہلے درویش نے اپنی داستان یہاں تک سنائی اور اچانک چہ زانو ہوکر بیٹھ گیا۔ پھر دیگر درویشوں کی جانب متوجہ ہوکر بولا :

" بھائیو! میں تو قصہ سنانے میں مصروف ہوں اور تم اسے شوق سے سننے میں مصروف ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دفتر کھل کر بند ہو جائے، ایمپلائمنٹ کارڈ تقسیم ہو جائیں اور ہم یہیں بیٹھے رہیں۔ لہذا ہر درویش باری باری سے دفتر کے حالات پر کڑی نظر رکھے "۔

دوسرا درویش بولا :

" اے درویش! تجھے غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں تیرا قصہ سُن رہا ہوں۔ میں تو برابر ٹکٹکی باندھے ایمپلائمنٹ کارڈ تقسیم کرنے والے کلرک کی کھڑکی کو دیکھ رہا ہوں۔ پس تو سکونِ قلب سے اپنے قصہ کو جاری رکھیو "۔

اس پر پہلا درویش اُٹھ کر قریبی نل کے پاس گیا، جب خوب سیر ہوکر پانی تناول کر چکا تو دوبارہ واپس ہوا اور یوں گویا ہوا :

" اے صاحبو! تو قصہ یوں چلتا ہے کہ میرے میٹرک کا امتحان کامیاب کرنے تک میرے والد کو طرح طرح کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ میری ایک کامیابی کے لیے میرے والد کو کئی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر میرے والد نے میرے خلاف گہری سازش کی اور ممتحن پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مجھے امتحان میں کامیاب کرا دیا "۔

جب میں کالج میں داخل ہوا تو زندگی نکھار پر آئی ہوئی تھی۔ ہر

طرف رنگینیاں تھیں لیکن میری زندگی کا وہی حال تھا یعنی میرا کلاس میں ٹکنا محال تھا۔ صاحبو! میں نے پڑھنے کی بہت کوشش کی لیکن چند جاسوسی ناولوں کے سوا کچھ نہ پڑھ سکا۔ انگریزی اور اُردو میں میری استعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر خوشی اس بات کی تھی کہ میرے دوستوں کی انگریزی بھی اتنی ہی کمزور تھی جتنی کہ میری۔ چنانچہ میں آپ حضرات کو اپنے ایک دوست کا قصہ سنانا چاہتا ہوں کہ ایک بار کینٹین میں ایک شخص سے لڑائی ہوگئی۔ اس شخص نے میرے دوست سے کہا:

"یو ڈیم ایڈیٹ!" میرے دوست نے اس کا کچھ نوٹس نہ لیا۔ البتہ وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ آدھا گھنٹہ نہ گزرا ہوگا کہ وہ پھر واپس ہوا اور نہایت غصہ کے عالم میں پوچھنے لگا "وہ شخص کہاں گیا جس نے مجھے ڈیم ایڈیٹ کہا تھا" ہم نے کہا وہ تو چلا گیا۔ اس پر وہ بولا مجھے اس کا اَتا پتہ بتاؤ میں اسے مزہ چکھانا چاہتا ہوں۔" ہم لوگوں نے کہا جب اس نے تمہیں ڈیم ایڈیٹ کہا تھا تو تم نے اسی وقت مزہ کیوں نہ چکھایا؟ وہ بولا:۔

"بھائیو! میں ابھی ابھی ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی دیکھ کر آرہا ہوں اور مجھ پر ابھی دو منٹ پہلے یہ انکشاف ہوا ہے کہ اس نے آدھا گھنٹہ پہلے مجھے گالی دی تھی۔" غرض دوستو! انگریزی کی بات تو بہت بڑی ہے خود میری اُردو اتنی کمزور تھی کہ میں بات چیت کرتے وقت بھی املا کی غلطیاں کر بیٹھتا تھا۔ اگر آپ اسے مذاق سمجھیں کہ ایک شخص بات چیت میں املا کی غلطیاں کس طرح کرسکتا ہے تو میں اس کے لئے آپ کو بیت بازی کے اس مقابلہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس میں میں شریک ہوا تھا۔ مخالف

ٹیم کے ایک طالب علم نے شعر پڑھا ؎

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

اس پر میں نے تڑاخ سے یہ شعر پڑھ دیا تھا ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اے میرے مونسو! غم خوارو! یہی وہ دن تھے جب میں پڑھنے پڑھانے سے عاجز آچکا تھا کہ ایک دن میری نظر کالج کی ایک حسینہ پر پڑی کہ جس حسینہ کا نام مہ لقا تھا اور جس کا محبوب عطر، عطرِ لخلخہ تھا۔ پہلی نظر میں تو میں اس لڑکی پر ہزار جان سے عاشق ہوگیا لیکن دوسری نظر میں اس پر بمشکل پانچ سو جان سے عاشق ہوسکا۔ کیونکہ جب میں نے اسے دوسری بار دیکھا تو اس کا میک اَپ اُتر چکا تھا۔ میں آٹھوں پہر عشق کی آگ میں جلنے لگا۔ ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ اس پری چہرہ حسینہ پر اپنے عشق کا اظہار کرنا چاہیے۔ اس وقت تک میرے عشق کی حالت یہ تھی کہ ع ایک ہی طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی مگر اس حسینہ کے حضور میں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سو میں نے ایک ترکیب نکالی اور اس کی ایک سہیلی کی خدمت میں حاضر ہو کر گڑگڑانے لگا: اے شہزادی مہ لقا کی سہیلی، بوجھ تو سہی میری پہیلی کہ میں مریضِ عشق ہوں اور دوا چاہتا ہوں تیری مہ لقا سے شفا چاہتا ہوں۔" وہ بولی: "اے ایس اے غلام بخت، کیا تو نے آج صبح آئینہ میں اپنی صورت دیکھی ہے کہ یوں بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے"۔ میں نے کہا: "خدا کے لئے مجھ عشق کے مارے پر بہکنے کا الزام عاید نہ کر۔ بات

دراصل یہ ہے کہ مجھے تیری سہیلی سے محبت ہوگئی ہے، اس کی ہر شئے سے مجھے اُلفت ہوگئی ہے اور میں تیرے وسیلے سے اپنی محبت کو پروان چڑھانا چاہتا ہوں۔ وہ بولی: "میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ میرے وسیلے سے بھلا تم دونوں کی محبت کس طرح پروان چڑھ سکتی ہے؟" میں نے کہا: "اے نادان لڑکی! تو اتنی معمولی سی بات بھی نہیں سمجھتی، جبھی تو بی۔اے میں دو سال سے فیل ہو رہی ہے۔ اگر تو نے واقعی میری بات نہیں سمجھی ہے تو سُن لے کہ ان دنوں ہر طرف سفارش کا سکّہ چل رہا ہے اور جہاں سفارش نہیں چلتی وہاں مکھن بازی چل رہی ہے۔ میں عشق کا ایک شاہ بے تاج ہوں اور تیری ایک سفارش کا محتاج ہوں۔ لہٰذا شہزادی مہ لقا کے نام ایک سفارشی خط لکھیو۔ مجھے یقین ہے کہ تیری سفارش سے میرا کام بن جائے گا اور باقی تیرا نام رہ جائے گا۔"

بالآخر اس لڑکی نے میرے دل کا مدعا پہچان لیا اور ایک گلابی رنگ کے کرم خوردہ کاغذ پر ایک سفارشی خط لکھ دیا۔ میں اس سفارشی خط کو لے کر خوشی خوشی شہزادی مہ لقا کے گھر کی طرف روانہ ہوا لیکن ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ میری نظر ایک مرد ٹریلین پوش پر پڑی جو اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑا زار و قطار رو رہا تھا غالباً اس کی بیوی مر گئی تھی اور وہ چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا "ہائے میں لُٹ گیا، میں تباہ ہوگیا۔ اب مجھے بدمزہ سالن کون کھلائے گا۔ اب مجھ سے بات بات پر لڑائی جھگڑا کون کرے گا۔ ہائے اب میری شیروانی میں سے پیسے کون چرائے گا۔ اب مجھ سے میری تنخواہ کا حساب کون پوچھے گا؟

اس مرد ٹریلین پوش کے دکھ کا یہ عالم تھا کہ اس کے آنسو تھامے نہ تھمتے تھے مجھے اس کی حالت پر بڑا رحم آیا۔ میرے دل میں ہمدردی اور ایثار کا سمندر

ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ میں مثل ایک تیر کے اس غم زدہ شخص کی جانب بڑھا اور بولا: "اے زود رنج انسان تیری آہ و بکا کوسن کر میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ تو ایک "عادی شوہر" ہے اور بیوی کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا"۔ پھر میں نے اپنی محبوبہ کے نام اس کی سہیلی کا دیا ہوا سفارشی خط اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "اے مرد ٹریلین کوش! اپنی زندگی سے یوں مایوس نہ ہو کہ تیرے درد کا علاج میرے پاس ہے۔ یہ سفارشی خط لیکر اور اسی وقت اس نازنین کے در دولت پر جا، جس کا پتہ اس لفافہ پر درج ہے۔ انشاء اللہ تیری مراد بر آئے گی۔ اصل میں یہ سفارشی خط میرے حق میں لکھا گیا تھا لیکن میں نے تیری گریہ وزاری کو سن کر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور میں ترے حق میں شہزادی مہ لقا سے دستبردار ہو رہا ہوں"۔

جذب و ایثار کے اس بے مثال واقعہ کے بعد میں مثل دیو داس، اُداس رہنے لگا۔ میری اُداسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں میں ملک کے بعض سیاسی قائدین کی سوانح عمریوں کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ ان سوانح عمریوں میں بار بار یہ ذکر ملتا کہ فلاں لیڈر نے "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" میں حصہ لیا اور تعلیم ترک کر دی۔ فلاں لیڈر نے "عدم تعاون کی تحریک" میں سرگرمی دکھائی اور تعلیم ترک کر دی۔ مجھے ان لیڈروں پر رشک آتا تھا، جنھوں نے "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" میں حصہ لینے کے بہانے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ ان دنوں میں ہاسٹل میں رہتا تھا۔ اور مجھے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ میں بعد از وقت پیدا ہوا ہوں۔ کیونکہ اب کالج چھوڑنے کے لئے کوئی بہانہ ملنا دشوار تھا۔ اس غم میں میں اچانک بیمار پڑا اور بستر مرگ بچھا کر سو گیا۔ ہاسٹل کے وارڈن صاحب بہت پریشان ہوئے

دُور دُور سے ڈاکٹروں بشمول ڈاکٹر آف فلاسفی کو طلب کیا گیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بالآخر ایک دن ایک حکیم صاحب نے جو یکتائے بیروزگار تھے میرا طبی معائنہ کیا اور وارڈن صاحب سے کہا: "مرض نہایت معمولی ہے اور اس کا علاج تو اس سے بھی معمولی ہے۔" وارڈن صاحب نے فرمایا: "حکیم صاحب تو پھر نسخہ تجویز فرما دیجئے۔" حکیم صاحب بولے: "نسخہ یہ ہے کہ اس مرد کو ہاسٹل کا فوڈ مانیٹر بنا دیجئے۔ چند دنوں میں نہ صرف بھلا ہو جائے گا بلکہ چنگا ہو جائے گا۔"

غرض مجھے فوڈ مانیٹر بنا دیا گیا اور میری صحت دن بہ دن اچھی ہونے لگی۔ اِدھر میری صحت بہتر ہونے لگی۔ اور اُدھر کالج میں میرے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ دشمنوں نے میرے خلاف گہری سازش کی اور مجھے بہلا پھسلا کر کالج یونین کے انتخابات میں کھڑا کر دیا۔ انتخابات میں دشمنوں نے مجھے جی کھول کر ووٹ دیئے اور میں بھاری اکثریت سے کالج یونین کا صدر منتخب ہو گیا۔ دشمنوں کی اس گہری سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دشمن تو پڑھائی لکھائی میں مصروف رہنے لگے اور میں خارج از نصاب سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا، یہاں تک کہ میرے دشمنوں نے امتحان میں ٹاپ کیا اور میں فیل بھی نہ ہو سکا کیونکہ مجھے نقل کرنے کے الزام میں کالج سے ایک سال کے لئے ریلس ٹیکیٹ کر دیا گیا۔

مگر اے میرے درویش بھائیو! میں نے کالج یونین کے صدر کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دیئے وہ کالج کی تاریخ میں سفید روشنائی سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ جب کبھی کالج جانے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا تو میں ہڑتال کروا دیتا تھا۔ جب بھی میرے ساتھیوں کا جی ہوٹنگ کرنے کی طرف مائل ہوتا تھا تو ایک عدد مشاعرہ منعقد کر ڈالتا تھا۔ میں نے کالج میں بے شمار ڈرامے کھیلے اور سالے

اہم کردار خود ادا کیے۔ ڈرامہ "شیریں فرہاد" میں میں نے فرہاد کا رول اس قدر اثر انگیزی کے ساتھ ادا کیا کہ نہر کھودنے کے منظر میں سارے اسٹیج کو کھود کر رکھ دیا اس کے بعد اس اسٹیج پر کوئی ڈرامہ نہ کھیلا جا سکا۔ ڈرامہ "رستم و سہراب" میں میں سہراب بنا لیکن میں نے ڈرامے کے آخری منظر میں رستم کو اس بری طرح پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اور ڈرامے کے مطابق مجھے ہلاک کرنے کا اہل نہ رہا۔ واضح ہو کہ جس لڑکے نے رستم کا کردار ادا کیا تھا وہ وہی تھا جس نے مجھے بہلا پھسلا کر کالج یونین کے انتخابات میں کھڑا کیا تھا۔

تو صاحبو! اس کے بعد میں لگاتار چار برس تک بی اے کا امتحان دیتا رہا۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ کالج کے پرنسپل صاحب مجھ پر مہربان ہو گئے۔ کیونکہ میں فرصت کے اوقات میں ان کے گھر کا سودا سلف لانے لگا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کلیدِ کامیابی یہی ہے۔ غرض جوں توں کر کے میں نے بی اے کا امتحان کامیاب کیا۔ اور گزشتہ چھ سال سے بیروزگار ہوں۔ یعنی اپنی ہی قسمت پر ماتم گسار ہوں۔ صاحبو! میری عمر اس وقت ۳۰ سال ہے اور روزگار کا ملنا محال ہے۔ گرانی اتنی بڑھ چکی ہے کہ صبح میں والد کی شیروانی سے ایک روپیہ چراتا ہوں تو شام تک ختم ہو جاتا ہے۔ صبح میں کھانا کھاتا ہوں تو دوپہر تک پھر بھوک لگ جاتی ہے۔ صبح میں سیکل کے پہیئے میں ہوا بھراتا ہوں تو شام تک پہیہ پنکچر ہو جاتا ہے۔ غرض گرانی نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ قیمتیں اس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہیں کہ دو پیسے میں ایک سگریٹ خرید کر پینے لگتا ہوں تو اس کا آدھا حصہ ایک پیسے میں پیتا ہوں اور جب بقیہ آدھا حصہ جلنے لگتا ہے تو مجھے پھر یہ دو پیسے میں پڑتا ہے۔"

پہلے درویش نے اپنی داستان ختم کی اور زار و قطار رونے لگا۔ وہ دراصل رونے کے لئے اپنی داستان کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا تو تیسرے درویش نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا: "میرے اچھے درویش بھائی! اب زیادہ رنج نہ کر کیونکہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، یعنی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی چٹا ہے اور کوئی بٹا ہے۔"

پہلے درویش نے ایک آہِ سرد کھینچی اور تیسرے گریجویٹ کو پرے ہٹاتے ہوئے بولا: "مگر بھائی کچھ تو معلوم ہو کہ ہمیں ملازمت کب ملنے والی ہے اور ہمارے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کب کھلنے والی ہے؟"

اس پر تیسرا درویش بولا: "اے میرے رفیق، تو ابھی تک خوابِ غفلت میں پڑا جاگ رہا ہے۔ معلوم یوں ہوتا ہے جیسے تو نے ایک خوشخبری ابھی تک نہیں سنی ہے۔"

خوشخبری کا لفظ سنتے ہی پہلا درویش گیند کی طرح اچھل پڑا اور تیسرے درویش کا گریبان پکڑ کر پوچھنے لگا: "یار بتا دے نا وہ خوشخبری کونسی ہے؟"

تیسرا درویش بولا: "اے میرے پیارے درویش بھائیو! میں آج تمہیں یہ خوشخبری سنانا چاہتا ہوں کہ حکومت نے ہم جیسے بیروزگاروں کی سہولت کے لئے وظیفہ پیرانہ سالی کی اسکیم منظور کی ہے جہاں ہم نے اپنی زندگی کے تیس سال ناامیدی میں گزار دیئے ہیں کیا ہم وہاں مزید تیس سال امیدِ روزگار میں نہیں گزار سکتے؟"

ابھی چاروں درویشوں نے اس خبر پر اچھی طرح مسرت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا کہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے کلرک نے آواز لگائی: "صاحبان! اپنے اپنے ایمپلائمنٹ کارڈ لائیے اور ان کی تجدید کروائیے۔" سارے درویش کاؤنٹر کی طرف دوڑ پڑے اور پہلے درویش کی داستان وہاں ختم ہوئی جہاں سے اسے شروع ہونا چاہئے تھا۔

غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی (پرائیویٹ اَن لمیٹڈ)

اِدھر جب سے دنیا تجارت کے جنگل میں پھنس گئی ہے اس وقت سے ہر شئے ترازو میں تُلنے اور تجارت کے سانچے میں ڈھلنے لگی ہے۔ ہمیں اس نوجوان کی بات اب بھی یاد ہے جس نے ایک کتب فروش کی دکان پر کھڑے ہو کر کتب فروش سے کہا تھا:

"جناب والا! مجھے کرشن چندر کے دو کلو افسانے، راجیندر سنگھ بیدی کی ڈیڑھ کلو کہانیاں اور فیض کی چار کلو غزلیں دیجئے۔"

اس پر کتب فروش نے ہماری آنکھوں کے سامنے کرشن چندر اور بیدی کی کہانیوں کے مجموعے ترازو میں تول کر دیئے اور فیض کی غزلوں کے بارے میں فرمایا:

"حضور والا! میں آپ کو فیض احمد فیض کی چار کلو غزلیں دینے کے موقف میں نہیں ہوں کیونکہ فیض کا سارا ادبی سرمایہ صرف دو کلو غزلوں پر مشتمل ہے۔

یقین نہ آئے تو "دستِ صبا" "نقشِ فریادی" اور "زنداں نامہ" کو تول کر دیکھ لیجئے۔

اس دن سے ہمیں یہ یقین ہوگیا کہ وہ دن دُور نہیں جب تجارت، ادب پر اس قدر غالب آجائے گی کہ لوگ شاعری کی بلیک مارکیٹنگ اور افسانوں کی ذخیرہ اندوزی کرنے لگیں گے (ویسے بیرونی ادب کی اسمگلنگ تو ہمارے ہاں اب بھی جاری ہے) مگر ہمارا یہ یقین اس وقت پختہ ہوا، جب ہمیں پتہ چلا کہ ایک صاحب نے "غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی، پرائیوٹ ان لمیٹڈ" قائم کر رکھی ہے۔ اور اس کمپنی کا کاروبار زوروں پر جاری ہے۔ چنانچہ ہم اس کمپنی کا معائنہ کرنے کی غرض سے اس مقام پر پہنچے جہاں "وارداتِ قلب" کو اشعار میں ڈھالا جارہا تھا، جب ہم اس کمپنی کے دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ لوگ قطار باندھے کھڑے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں کورے کاغذات ہیں۔ ہم نے ان لوگوں سے پوچھا:

"صاحبو، آپ لوگ کون ہیں، یہاں کیوں کھڑے ہیں اور آپ نے ہاتھوں میں کورے کاغذات کیوں پکڑ رکھے ہیں؟"

اس پر ایک نازک اندام نوجوان جس کے بال بڑھے ہوئے تھے، آگے بڑھا اور بولا:

"جنابِ والا! ہم ماڈرن شاعر ہیں اور فکرِ شعر میں وقت برباد نہیں کرتے، اسی لئے ریڈی میڈ غزلیں خریدنے آئے ہیں اور ہمارے ہاتھوں میں کورے کاغذات اس لئے ہیں کہ ہم ان پر غزلیں لکھوا کرلے جائیں گے۔"

نوجوان کا یہ جواب سن کر ہم آگے بڑھنے لگے تو قطار میں ایک شور بلند ہوا:

"صاحب! قطار میں ٹھہریئے، ہم تو صبح سے یہاں کھڑے ہیں۔ آپ دیر سے آئے ہیں اس لئے آپ کو قطار میں سب سے پیچھے ٹھہرنا چاہئے۔"

ہم نے شعراء کی ہوٹنگ کا کوئی نوٹس نہ لیا اور کمپنی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ ایک کمرے میں ہمیں اس کمپنی کے پروپرائٹر مسٹر عبدالرحیم وفا نظر آئے جو ہاتھ میں قینچی پکڑے ایک غزل کو

کاٹ رہے تھے ۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولے : "مکرّر مکرّر !" ہم نے اپنا دوبارہ تعارف کرایا تو وہ بے حد خوش ہوئے اور بولے :

" معاف کیجئے، میں ذرا اونچا سنتا ہوں، اسی لئے آپ کو اپنا تعارف مکرر کروانا پڑا ۔"

پھر بولے : " میں آپ کو اپنی کمپنی کا معائنہ ضرور کراؤں گا ۔ مگر آپ کو پانچ منٹ تک انتظار کی زحمت برداشت کرنی ہوگی ۔ کیونکہ اس وقت میں ایک غزل کو کاٹ رہا ہوں "۔ پھر جب وہ قینچی لے کر دوبارہ غزل کاٹنے میں مصروف ہوگئے تو ہم نے ازراہِ تجسس ان سے پوچھا:

" قبلہ آپ قینچی سے اس غزل کو کیوں کاٹ رہے ہیں ؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولے : " بھئی، بات دراصل یہ ہے کہ یہ غزل بڑی بحر میں لکھی گئی ہے اور اب میں اسے کاٹ کر چھوٹی بحر کی دو غزلیں برآمد کروں گا کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور شعرا کے ڈھیروں آرڈرز میرے پاس پڑے ہوئے ہیں ۔"

یہ کہہ کر انھوں نے غزل کاٹی اور نوکر کو بلا کر کہا :

" میاں، یہ غزلیں اسی وقت میوزک ڈائرکٹر کے پاس لے جاؤ اور کہو کہ شام تک ان دونوں غزلوں کا ترنّم فٹ ہو جائے ۔ کیونکہ آج رات میں مشاعرہ ہے اور جناب ترنّم روحانی اس مشاعرہ میں یہ غزلیں پڑھیں گے ۔"

ہم نے پوچھا : " یہ ترنّم روحانی کون ہیں ؟"

بولے : " ہمارے بہت پرانے گاہک ہیں آپ انھیں نہیں جانتے ؟ یہ تو ہمارے ملک کے ممتاز شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں اور ہمیں فخر ہے کہ وہ گزشتہ بیس برسوں سے ہماری کمپنی سے غزلیں اور ان کا ترنّم خرید رہے ہیں ۔"

پھر جناب عبدالرحیم وفا نے اپنی داستانِ الم انگیز یوں بیان کرنی شروع کی :

" جنابِ والا، میں بچپن ہی سے اس نظریہ کا قائل رہا ہوں کہ شعرا تین قسم کے ہوتے ہیں :

ایک پیدائشی شاعر، دوسرا موروثی شاعر اور تیسرا نمائشی شاعر ___ پیدائشی شاعر تو وہ ہوتا ہے جو پیدا ہوتے ہی مطلع عرض کرتا ہے، یعنی روتا بھی ہے تو علمِ عروض کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس کے رونے میں بھی ایک ترنم پوشیدہ ہوتا ہے اور ابھی دس بارہ سال کا بھی ہونے نہیں پاتا کہ "صاحبِ دیوان" بن جاتا ہے۔ موروثی شاعر وہ ہوتا ہے جسے شاعری ورثہ میں ملتی ہے، یعنی اصل میں اس کا باپ شاعر ہوتا ہے اور جب وہ مرتا ہے تو اپنے پیچھے قرض خواہوں کے علاوہ غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں چھوڑ جاتا ہے۔ پس اس کا بیٹا ان غزلوں اور نظموں کو وقفہ وقفہ سے رسائل میں چھپواتا ہے اور موروثی شاعر ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے۔ لیکن شاعروں کی ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے جو نمائشی شاعر کہلاتی ہے۔ سچ پوچھیے تو ان دنوں ہر طرف نمائشی شعراء کی بھرمار ہے جو کہیں سے غزلیں لکھوالاتے ہیں۔ اور انھیں مشاعروں میں پڑھ کر نام کماتے ہیں۔ چونکہ میں ابتدا ہی سے پیدائشی شاعر رہا ہوں اس لیے میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ بڑا ہوکر ایک ایسی کمپنی قائم کروں گا جہاں سے نمائشی شعراء کو سستے داموں پر غزلیں اور نظمیں فراہم کی جائیں۔ چنانچہ میں نے نہایت قلیل سرمائے سے کمپنی کا آغاز کیا۔ میں نے ایک سکنڈ ہینڈ قلم اور ایک سکنڈ ہینڈ دوات خریدی اور مستقبل کی طرف روانہ ہوگیا۔ ابتدا میں میرا طریقۂ کار یہ تھا کہ میں اپنے ہاتھ میں قلم پکڑ کر گلی گلی آوازیں لگاتا پھرتا کہ "غزل لکھوائیے، نظم کی اصلاح کروائیے۔" وہ دن میرے لئے سخت آزمائش کے تھے جب ہر طرف "پیدائشی شاعر" نظر آیا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ نمائشی شعرا بھی نمودار ہونے لگے اور میرا کاروبار چل پڑا۔ جب میری حالت ذرا سنبھلی تو میں نے ایک ٹھیلہ خریدا اور اس ٹھیلے میں غزلیں، نظمیں، سہرے اور رباعیاں رکھ کر فروخت کرنے لگا رفتہ رفتہ میری گمنامی دُور دُور تک جا پہنچی اور لوگ دُور دُور سے غزلیں لکھوانے کے لئے آنے لگے۔ میرا نصیب جاگ اُٹھا اور میں اتنا مالدار ہوگیا کہ آج "غزل سپلائنگ اینڈ

مینوفیکچرنگ کمپنی" کا پروپرائٹر ہوں۔ اب میں نے چار پیدائشی شعراء کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں جو دن رات غزلیں، نظمیں، رباعیاں اور قطعات لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے ایک میوزک ڈائرکٹر کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں جو مختلف غزلوں کا ترنم فِٹ کرتا ہے۔ پھر میں نے اپنی کمپنی میں ایک نیا شعبہ بھی قائم کیا ہے جسے "شعبۂ سامعین" کا نام دیا گیا ہے۔ اس شعبے کے ذمّہ یہ کام ہے کہ وہ مشاعروں میں سامعین کو روانہ کرے اور کمپنی کی فراہم کردہ غزلوں پر کچھ ایسی داد دے کہ اچھے خاصے نمائشی شاعر پر "پیدائشی شاعر" کا گمان ہونے لگ جائے۔ چنانچہ میں فی سامع سواری خرچ کے علاوہ دو روپے چارج کرتا ہوں۔ میرا یہ نیا شعبہ بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ کیونکہ مشاعرے زیادہ تر راتوں ہی میں منعقد ہوتے ہیں۔ ہمارے سامعین کسی شاعر کے کلام پر اس زور و شور سے داد دیتے ہیں کہ خود بے چارے شاعر کا کلام کوئی سننے نہیں پاتا۔ اب میں نے ایک "شعبۂ ہوٹنگ" بھی قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ کمپنی کے مخالفین کے دانت کھٹّے کیے جائیں۔"

مسٹر عبدالرحیم وفا ابھی اپنی داستان بیان ہی کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی اور وہ ریسیور اٹھا کر کہنے لگے:

"ہیلو! کون؟ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا! شادانی صاحب بات کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ! مجھے معلوم ہے کہ مشاعرہ آج رات میں ہے لیکن میں مجبور ہوں، کیونکہ آپ نے ابھی تک دو پرانی غزلوں کی قیمت ادا نہیں کی۔ جب تک پچھلا حساب صاف نہ ہو جائے میں آپ کے لئے ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتا۔"

"کیا کہا! مشاعرہ میں آپ کو معاوضہ ملنے والا ہے، یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ آپ کو مشاعرہ میں معاوضہ ملتا ہے، گزشتہ بار بھی آپ کو معاوضہ ملا تھا، لیکن آپ نے میری غزلوں کی اجرت ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ آپ مجھ سے پانچ روپے میں ایک غزل

لے جاتے ہیں اور اسے مشاعرہ میں پڑھ کر پچیس تیس روپے معاوضہ حاصل کر لیتے ہیں۔ میں کبھی یہ برداشت نہیں کروں گا کہ آپ میری شاعری کے علاوہ میری دولت کا بھی استحصال کریں۔"

اس کے بعد ٹیلیفون پر طویل وقفہ رہا اور شادانی صاحب دوسری طرف سے مسلسل بولتے رہے۔ اور آخر میں وفا صاحب جھنجھلاتے ہوئے بولے :

" دیکھئے، شادانی صاحب، میں آپ کو غزل ضرور لکھ دیتا، لیکن میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے خود صدرِ مشاعرہ کی غزل کہنی ہے۔ بہتر ہے کہ آج آپ مشاعرہ میں نہ جائیے"

اس کے بعد وفا صاحب نے بڑے زور سے ریسیور رکھ دیا اور بولے :

" بدتمیز کہیں کے، جب غزل لکھوانی ہوتی ہے تو یوں منت سماجت کرتے ہیں جیسے کوئی فقیر بھیک مانگ رہا ہو۔ لیکن جب مشاعرے میں میری ہی غزل میرے سامنے پڑھتے ہیں تو میری طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے اپنی ذاتی غزل سنا رہے ہوں۔"

پھر وفا صاحب نے اپنے حواس درست کیے اور بولے : "میں آپ کو اپنی کمپنی کی داستان تو سنا چکا ہوں، اب آپ میرے پراسپکٹس کا مطالعہ فرمائیے جس سے آپ کو میری کمپنی کی جملہ تفصیلات کا علم ہو جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے پراسپکٹس ہمارے سامنے پھینک دیا ہم نے موقع کو غنیمت جانا اور ایک پراسپکٹس اپنے ساتھ لے آئے جسے من و عن یہاں نقل کیا جا رہا ہے :

غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی پرائیویٹ ان لمیٹڈ

پراسپکٹس

- گاہکوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے تخلص کا خود انتخاب کریں۔ ایک بار آپ نے تخلص رکھ لیا تو آپ کو مکمل شاعر بنانے کی ذمہ داری کمپنی پر عاید ہوگی۔
- بیک وقت چار غزلوں کا آرڈر دینے پر ایک قطعہ مفت فراہم کیا جائے گا۔

● اگر کمپنی کی فراہم کردہ کسی غزل پر مشاعرہ میں ہوٹنگ ہو تو اس کی ذمہ داری کمپنی پر عاید نہ ہوگی۔ ہم غزل کو ہوٹنگ سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری صرف اسی صورت میں قبول کرسکتے ہیں جب کہ آپ ہمارے "شعبہ سامعین" کی خدمات سے استفادہ کریں۔

● غزلوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی ذمہ داری بھی متعلقہ شعراء پر ہی عاید ہوگی' کیونکہ کمپنی صرف شعر کہتی ہے' شعراء کو 'قاعدہ' نہیں پڑھا سکتی۔

● بڑی بحر کی غزل کے پانچ اشعار کی قیمت دس روپے اور چھوٹی بحر کی غزل کے پانچ اشعار کی قیمت آٹھ روپے ہوگی۔ اگر کوئی صاحب صرف ایک مصرعہ خریدنا چاہتے ہیں تو ان سے پورے شعر کی اُجرت وصول کی جائے گی۔

● اگر کوئی صاحب کمپنی ہذا سے آزاد نظمیں لکھوانا چاہتے ہوں تو انھیں اپنی دماغی صحت کے بارے میں سب سے پہلے ایک طبی صداقت نامہ پیش کرنا ہوگا۔

● اگر کوئی صاحب "سہرا" لکھوانا چاہتے ہوں تو واضح ہو کہ کمپنی سہرا نگاری کی بھاری اُجرت وصول کرتی ہے۔ کیونکہ دوسروں کی شادی پر خوشی کا اظہار کرنا ایک بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔

● کمپنی ہذا نے گاہکوں کے لئے غزلیں کرایہ پر دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ لیکن کوئی غزل چوبیس گھنٹوں سے زیادہ عرصے کے لئے اپنے پاس نہ رکھی جائے۔ کیونکہ جب سائیکلیں کرایہ پر دی جاتی ہیں تو انھیں بھی اسی شرط کے ساتھ کرایہ پر دیا جاتا ہے۔

● گاہکوں کو غزلوں کی قیمت نقد ادا کرنی ہوگی کیونکہ شعراء کو اُدھار غزلیں دینا' دنیا کی سب سے بڑی غلطی ہے۔

● ہم نے گاہکوں کی سہولت کی خاطر پرانی غزلوں کی ریپرنگ کا بھی بندوبست کیا ہے۔ لیکن یہ غزلیں اتنی پرانی' بوسیدہ اور شکستہ نہیں ہونی چاہئیں کہ ان کی ریپرنگ پر نئی غزل کی لاگت آئے۔

- ایک بار فروخت کی ہوئی غزلیں واپس نہیں لی جائیں گی۔ البتہ مستعمل غزلیں نصف قیمت پر خریدی جائیں گی۔

ہم نے کمپنی کا پراسپیکٹس بغور پڑھا اور مسٹر عبدالرحیم وفا سے رخصت ہو کر واپس آگئے۔ اب ہم عوام کی اطلاع کے لئے اسے شائع کر رہے ہیں تاکہ جو کوئی صاحب خواہ مخواہ شاعر بننے کی تمنا رکھتے ہوں وہ شاعری کی اس بہتی ہوئی گنگا میں ہاتھ دھولیں اور یوں سارے پانی کو گندہ کر دیں۔

لائبریری میں چند گھنٹے

جب میرے پاس ہوٹل میں چائے پینے کے لئے پیسے نہیں ہوتے، جب میں فلم دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا، جب میں زندگی سے بیزار ہوجاتا ہوں اور جب بیوی سے میری لڑائی ہوجاتی ہے اور جب قرض خواہ میری تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں تو ــــــ میں چپ چاپ لائبریری چلا جاتا ہوں۔ ہوسکتا ہے، مندرجہ بالا صورتوں میں آپ بھی لائبریری چلے جاتے ہوں! کیونکہ میری نظر میں شراب خانہ اور لائبریری دو ایسی جگہیں ہیں، جہاں انسان اپنا غم غلط کرسکتا ہے۔ چونکہ شراب خانہ میں آپ کے غم کے ساتھ شراب کے بل کا دُم چھلا بھی لگا رہتا ہے، اسی لئے میں اپنا غم غلط کرنے کے لئے لائبریری کو ترجیح دیتا ہوں کہ یہاں ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آجاتا ہے۔

میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ قسم کھانے کو تیار ہوں کہ آج تک میں نے لائبریری میں کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ کیونکہ جب سارے ہی لوگ کتابیں پڑھنے میں مصروف ہوتے

ہیں کہ میں ان کے چہرے پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ہوں، وہ اس لئے کہ میری نظر میں انسانوں کے چہرے پڑھنا کتابیں پڑھنے سے کہیں زیادہ دلچسپ کام ہوتا ہے۔ آپ ہی اندازہ لگائیے، جب بھانت بھانت کے لوگ ایک ہی میز پر جمع ہو کر کتابیں پڑھنے لگتے ہیں تو کتنی دلچسپ صورتِ حال پیدا نہیں ہوتی۔ ہر طرف کتابیں ہی کتابیں ہوتی ہیں، چاروں طرف علم کا سمندر پھیلا رہتا ہے اور لائبریری میں بیٹھے ہوئے چند اشخاص مجھے سمندر کی سطح پر تنکوں کی مانند نظر آتے ہیں۔ کبھی میرے دل میں بھی کتابیں پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی لیکن جب میں نے لائبریری کی ہزاروں لاکھوں کتابوں پر نظر ڈالی تو میری ہمت ٹوٹ گئی۔ میرے قویٰ معطّل ہو گئے، میں نے سوچا کہ اتنی ساری کتابوں کو پڑھنے کے لئے تو مجھے پچاس مرتبہ اس دنیا میں پیدا ہونا پڑے گا۔ اور پچاس مرتبہ پیدا ہونے کا مطلب ہے کہ مجھے پچاس مرتبہ شادی بھی کرنی پڑے گی، پچاس مرتبہ بچے بھی پیدا کرنے پڑیں گے مجھے صرف کتابیں پڑھنے کے لئے پچاس مرتبہ پیدا ہونا منظور ہے لیکن شادی اور بچوں کا چکر ایسا برا ہے کہ میں شوقِ مطالعہ میں بار بار پیدا ہونے کی خواہش رکھنے کے باوجود اس دنیا میں دوبارہ پیدا ہونا نہیں چاہتا۔

ظاہر ہے، اس احساس کے بعد میرے حوصلے پست ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ اتنی ساری کتابیں، میں اس جنم میں نہ پڑھ سکوں گا، لہٰذا صبر کرنے اور بقیہ زندگی جہالت کے سہارے گزارنے کی ٹھان لی۔ کتابوں کے اتنے بڑے انبار کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھ پر وہی کیفیت طاری ہوئی جو جنگل میں شیر کو اچانک اپنے روبرو دیکھ کر بکری پر طاری ہو جاتی ہے۔ وہ دن اور آج کا دن، میں نے کبھی لائبریری میں کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ اب میں صرف دل بہلانے کے لئے لائبریری جاتا ہوں اور لوگوں کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کر کے

خوش ہوتا ہوں۔

آیئے اب میں آپ کا تعارف ان افراد سے کراؤں جو مختلف وجوہات کی بنا پر لائبریری میں آتے ہیں اور لائبریری کو کبھی ہوٹل کے طور پر استعمال کرتے ہیں، کبھی گھر کے طور پر، کبھی خواب گاہ کے طور پر اور کبھی ڈرائنگ روم کے طور پر۔ یہ صاحب جو لائبریری کی بڑی میز کے ایک کونے پر اپنی کہنیاں رکھے اونگھ رہے ہیں اس لائبریری کے بڑے پرانے ناظر ہیں۔ یہ ہر روز صبح میں آتے ہیں 'رجسٹر ناظرین' میں اپنے انگوٹھے کا نشان ثبت کرتے ہیں' پھر تکمیل ضابطہ کے لئے دو چار کتابیں لائبریری سے حاصل کرتے ہیں' اور انھیں میز پر اپنے سامنے بچھا کر لیٹ جاتے ہیں۔ گویا صحیح معنوں میں کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ پھر ان پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگتا ہے۔ تب رفتہ رفتہ لائبریری کے ہال میں ان کے خراٹے "پس منظر کی موسیقی" کے طور پر اُبھرنے لگتے ہیں اور لائبریری کا سارا ماحول نغمہ ریز ہو جاتا ہے۔ ایک دن مجھے اتفاق سے ان کے بازو بیٹھنے کا موقع ملا۔ اس دن میرا ایک دوست بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں ان کے بازو والی کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ کسی بات پر مجھے ہنسی آئی تو میں نے زور زور کا قہقہہ لگایا۔ اس پر ان کی نیند اُچٹ گئی۔ انھوں نے اپنی لال لال ڈوروں والی خمار آلودہ آنکھیں ایک منٹ کے لئے کھولیں اور ان خمار آلود آنکھوں سے ایک قہر آلود نگاہ مجھ پر ڈالی اور بولے "مسٹر یہ لائبریری ہے ذرا آہستہ باتیں کیجئے۔"

اس پر میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا "جی ہاں مسٹر یہ لائبریری ہے یہاں آپ بھی خراٹے ذرا آہستہ لیجئے۔"

وہ بولے "دیکھئے مسٹر خراٹے انسان نیند میں لیتا ہے' اس لئے خراٹے اس کے قابو میں نہیں رہتے لیکن آپ تو جاگتے میں باتیں کر رہے ہیں' آپ کم از کم اپنی باتوں پر

پر تو قابو پا سکتے ہیں۔ لہذا میرے خراٹوں کو نشانِ ملامت بنانے سے پہلے اپنی زبان کو لگام دیجئے۔"

یہ کہہ کر ان صاحب نے نہایت غصہ سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور پھر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ میں بڑی دیر تک ان کی اس انوکھی منطق پر بھونچکا سا رہ گیا۔ میری زبان گنگ ہوگئی۔ میرے ہوش و حواس معطل ہوگئے۔ اس دن کے بعد سے میں نے کبھی ان کی نیند میں خلل ڈالنے کی جسارت نہیں کی۔ یوں بھی اس واقعہ کے بعد کبھی مجھ سے ان کی آنکھیں چار نہیں ہوئیں۔ کیونکہ میں نے جب بھی انھیں دیکھا سوتا ہوا پایا۔

یہ تو ان ناظر صاحب کا ذکر ہوا جو لائبریری میں صرف سونے کے لئے آتے ہیں لیکن بعض ناظرین ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ پڑھنے اور کچھ سونے کے لئے آتے ہیں۔ ان کا پروگرام "ہمہ مقصدی" ہوتا ہے۔ ایسے ناظرین بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب نیند سے جاگ پڑیں گے اور کب پڑھتے پڑھتے سو جائیں گے۔ یہ کتاب کھول کر پڑھنے لگتے ہیں تو اچھے خاصے رہتے ہیں لیکن دو تین صفحوں کے بعد ان کے چہرے پر ایسے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں جو مرگی کے مریض پر مرگی کے حملے کے وقت پیدا ہوتے ہیں۔ چہرے کے اُتار چڑھاؤ میں دھیرے دھیرے تبدیلی پیدا ہونے لگتی ہے۔ آنکھوں کے دائرے رفتہ رفتہ یوں سکڑنے لگتے ہیں جیسے چودھویں تاریخ کے بعد چاند کی جسامت کم ہونے لگتی ہے۔ پھر پلکیں نہایت غیر محسوس طور پر بند ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد ایک طرف تو ان کا منہ کھلا رہ جاتا ہے اور دوسری طرف کتاب کھلی رہتی ہے ــــ میں ایسے ناظرین کے ساتھ بڑا دلچسپ مذاق کرتا ہوں۔ جب وہ سو جاتے ہیں تو نہایت آہستگی سے ان کے ہاتھ سے کتاب کھینچ لیتا ہوں اور خود پڑھنے لگتا ہوں جب میں

دو چار صفحے پڑھ ڈالتا ہوں تو ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ یہ نیند سے چونک پڑتے ہیں اور اپنے ہاتھ میں کتاب کو نہ پاکر ایک دم کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور چلّانے کے انداز میں کہتے ہیں" میری کتاب! میری کتاب!!"

اس پر میں انھیں سمجھاتا ہوں: "قبلہ آپ فکر نہ کیجئے، آپ کی کتاب میرے پاس ہے، آپ سو رہے تھے اور کتاب چونکہ خالی تھی اس لئے میں نے آپ کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے اس کتاب کا مطالعہ شروع کردیا ہے۔ آپ نے تین صفحوں تک اس کتاب کو پڑھا تھا، اس کے بعد میں نے سات صفحے پڑھ ڈالے ہیں۔ اس طرح ہم دونوں نے مل کر اس کتاب کے دس صفحے پڑھ لئے ہیں۔ اب آپ گیارھویں صفحہ سے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ تب تک میں سو جاتا ہوں۔ جب آپ کو نیند آنے لگے تو مجھے جگا دیجئے، میں پھر اس کتاب کو وہاں سے پڑھوں گا جہاں سے آپ کو نیند آئے گی۔ امداد باہمی نہایت اہم تحریک ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم امداد باہمی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اس کتاب کو ایک نہ ایک دن ختم کر ڈالیں گے۔" میری اس لمبی تقریر کو سن کر ناظر صاحب آگ بگولا ہو جاتے ہیں اور میرے ہاتھ سے کتاب چھینتے ہوئے گویا ہوتے ہیں:

" خبردار جو تم نے آئندہ سے نیند میں میرے ہاتھ سے کتاب چھیننے کی کوشش کی۔ بدتمیز کہیں کے، بڑے بداخلاق معلوم ہوتے ہو۔"

اور میں کہتا ہوں" حضور والا! لائبریری میں آکر سو جانا کہاں کی خوش اخلاقی ہے۔" اس پر وہ میری بداخلاقی کو مسلّمہ جان کر اپنی نشست سے اُٹھ جاتے ہیں اور دوسری نشست پر جاکر از سرِ نو سونے کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔

ایسے ہی ایک اور ناظر صاحب نے بڑی دلچسپ حرکت کی تھی۔ وہ ایک ناول پڑھتے پڑھتے سو گئے لیکن کتاب ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ البتہ ہوا کے جھونکوں سے

کتاب کے کئی اوراق پلٹ گئے۔ جب نیند سے جاگے تو انھوں نے پھر سے ناول کا مطالعہ شروع کر دیا، مگر ایک دو پیراگراف پڑھنے کے بعد وہ کچھ پریشان پریشان سے نظر آئے، پھر اپنی بغلیں جھانکنے لگے۔ دائیں بائیں نظریں دوڑائیں۔ میں ان کے بازو ہی بیٹھا تھا۔ انھوں نے مجھے بڑی مشکوک نظروں سے دیکھا، پھر جھجکتے ہوئے بولے: "گستاخی معاف! کیا آپ نے اس ناول کے ہیرو کو یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا ہے؟"

میں نے کہا: "آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ بھلا ناول کا ہیرو بھی کہیں ناول سے باہر جا سکتا ہے؟"

وہ بولے: "بالکل بجا فرماتے ہیں آپ۔ یہی تو میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میرے سونے سے پہلے ناول کا ہیرو، ویلن کی پٹائی کر رہا تھا لیکن اب جاگا ہوں تو ناول کے ہیرو کا والد، ہیرو کی تلاش میں صحراؤں کی خاک چھان رہا ہے۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے، آخر یہ ہیرو گیا کہاں؟"

میں نے کہا: "قبلہ اصل بات یہ ہے کہ ہوا کے جھونکوں نے آپ کو ناول کے ہیرو سے بہت دور کر دیا ہے۔ براہ کرم پچھلے صفحات اُلٹیے اور کتاب کو وہاں سے شروع کیجیے جہاں آپ سونے سے پہلے موجود تھے۔" اس پر انھوں نے از سر نو صفحے اُلٹے اور جب انھیں پھر سے ہیرو ویلن کی پٹائی کرتا ہوا مل گیا تو بے حد خوش ہوئے اور مجھ سے بولے:

"آپ کی رہنمائی کا بے حد شکریہ۔ اس صفحہ پر ہیرو بدستور ویلن کی پٹائی کر رہا ہے۔ اگر آپ میری رہنمائی نہ کرتے تو میں بدستور پریشان رہتا۔"

میں نے کہا: "اور ہیرو بھی بدستور ویلن کی پٹائی کرتا رہتا اور اندازہ لگائیے کہ آپ کی نیند کی وجہ سے بیچارے ویلن کی کتنی درگت بنتی!" وہ مسکرا کر چپ ہو گئے۔ اور میں اپنے دانت پیس کر چپ ہو گیا۔

اکثر لائبریریوں میں یہ عبارت درج ہوتی ہے : "براہ کرم خاموشی سے مطالعہ کیجئے ۔" لیکن سونے والے ناظرین کے آرام کی خاطر میرا جی اس عبارت میں ترمیم کر کے یوں لکھنے کو چاہتا ہے : " براہ کرم خاموشی سے مطالعہ کیجئے ورنہ ناظرین کی نیند میں خلل پڑے گا ۔"

لائبریری کے پچاس فیصد ناظرین ایسے ہوتے ہیں جو صرف سونے کی غرض سے لائبریری آتے ہیں ۔ بقیہ ناظرین کی آمد کی وجوہات مختلف ہوتی ہیں ۔

میں ایک ناظر صاحب سے واقف ہوں جو صرف موسم برسات میں بڑی پابندی سے لائبریری آتے ہیں ۔ ان کی حیثیت برساتی مینڈک کی سی ہوتی ہے جو برسات کے موسم میں نکل آتے ہیں اور پھر کہیں غائب ہوجاتے ہیں ۔ میں کئی دنوں تک یہ سمجھ نہ سکا کہ یہ صاحب صرف موسم برسات میں کیوں لائبریری آتے ہیں ۔ ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا ۔ میں نے پورے ادب و احترام کے ساتھ ان سے پوچھا :

" اجی حضرت ! یہ کیا بات ہے کہ آپ صرف برسات میں مطالعہ کی طرف راغب ہوتے ہیں ، اور دوسرے موسموں میں کبھی مطالعہ کی طرف راغب نہیں ہوتے ؟"

اس پر وہ یخ بستہ آہ کھینچتے ہوئے بولے :

" بھائی ! بات دراصل یہ ہے کہ برسات کے موسم میں میرے مکان کی چھت بہت ٹپکتی ہے ۔ چونکہ لائبریری کی چھت نہیں ٹپکتی اسی لئے میں موسم برسات میں مطالعہ کی طرف راغب ہوتا ہوں اور بقیہ موسموں میں اپنے گھر میں نہایت آرام سے زندگی گزارتا ہوں ۔"

مجھے لائبریری میں ان ناظرین کے انہماک کا جائزہ لے کر بھی بڑا لطف ملتا ہے جو واقعی کتابیں پڑھنے آتے ہیں ۔ ایک بار میرے سامنے دو ناظرین بیٹھے کتابیں پڑھنے میں منہمک تھے ۔ ایک کے ہاتھ میں مصورِ غم علامہ راشد الخیری کا

کا کوئی ناول تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں شفیق الرحمٰن کی کوئی کتاب تھی وہ کتابیں پڑھ رہے تھے اور میں نہایت غور سے ان کے چہروں کو پڑھ رہا تھا۔ علامہ راشد الخیری کے ناظر کے چہرے پر حسرت و یاس کے سارے آثار ہویدا تھے اور شفیق الرحمٰن کے ناظر کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ جب راشد الخیری کے ناول میں کوئی درد انگیز حصہ آیا تو عین اسی وقت شفیق الرحمٰن کی کتاب میں کوئی مزیدار لطیفہ نکل آیا۔ اس پر راشد الخیری کے ناظر نے بڑے درد کے ساتھ ایک ٹھنڈی آہ کھینچی اور عین اسی وقت شفیق الرحمٰن کے ناظر نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس پر راشد الخیری کے ناظر نے شفیق الرحمٰن کے ناظر کی طرف نہایت حقارت سے دیکھا اور پھر پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر وہی واقعہ پیش آیا اِدھر اس ناظر نے آہ بھری اور اُدھر اس ناظر نے قہقہہ لگایا۔ راشد الخیری کے ناظر نے یہ سمجھا کہ دوسرا ناظر اس کا مذاق اُڑا رہا ہے۔ سو اس نے اچانک شفیق الرحمٰن کے ناظر کا گلا پکڑ لیا اور بولا : " اگر تم نے آئندہ پھر قہقہہ لگایا تو تمہارا کچومر نکال دوں گا۔" تب میں نے فوراً بیچ بچاؤ کر کے انھیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا کہ :

" میاں تم اپنی کتاب میں مگن ہو اور وہ اپنی کتاب میں مگن ہیں۔ اس میں لڑائی جھگڑے کی کیا بات ہے؟" جب دونوں نے اپنی اپنی کتابوں کا جائزہ لیا تو خود بخود خاموش ہوگئے اور پھر سے آہیں بھرنے اور قہقہے لگانے میں مصروف ہوگئے۔

میں ناظرین کے چہروں کو پڑھنے کا اب اتنا ماہر ہوگیا ہوں کہ میں دور ہی سے کسی ناظر کے چہرے کو دیکھ کر یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ کونسی کتاب پڑھ رہا ہے۔ اگر کوئی قاری مسلسل اُونگھ رہا ہو تو سمجھئے کہ وہ ضرور فلسفہ کی کوئی کتاب پڑھ رہا ہے اگر قاری تھوڑی دیر اونگھ رہا ہو اور تھوڑی دیر جاگ رہا ہو تو جانئے کہ وہ معاشیات کی کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ اگر قاری پر رقت طاری ہو اور اس کا چہرہ یوں نظر

آرہا ہو جیسے اس نے کاسٹر آئیل پی رکھا ہو تو سمجھئے کہ وہ ضرور کوئی المیہ رومانی ناول پڑھ رہا ہے۔ اگر قاری کے چہرے سے وحشت برس رہی ہو اور وہ خوفزدہ سا نظر آرہا ہو تو جانئے کہ وہ ضرور کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہا ہے۔

میں لائبریری میں لوگوں کے چہروں کو پڑھنے کے علاوہ کبھی کبھی نوجوانوں کے دلوں کو بھی پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں ایسے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے واقف ہوں جو لائبریری میں علم کی پیاس بجھانے نہیں بلکہ اپنی نظر کی پیاس بجھانے آتے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لائبریری کو اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے مجنوں نے صحرا کا استعمال کیا تھا۔ مجنوں لیلیٰ کی تلاش میں صحراؤں کی خاک چھانتا پھرتا تھا اور یہ اپنی محبوباؤں کی تلاش میں لائبریریوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ لائبریری ان کے لیے وہ مقام بن جاتی ہے جہاں دو بچھڑے ہوئے دل آپس میں مل جاتے ہیں۔ اِدھر سے محبوبہ رجسٹر ناظرین میں دستخط کرکے داخل ہوتی ہے، اُدھر سے عاشق صاحب بھی رجسٹر ناظرین میں دستخط کرکے داخل ہو جاتے ہیں۔ پھر نظریں چار ہوتی ہیں، دل کے معاملات سلجھنے لگتے ہیں۔ نظروں کی پیاس بجھنے لگتی ہے، دلوں پر ایک سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تب یہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔

میں ایک ایسے ہی نوجوان سے واقف ہوں جو اپنی محبوبہ سے ملنے ہر روز لائبریری آتا ہے۔ میں نے اسے اور اس کی محبوبہ کو کبھی کتابیں پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ایک دن میں نے اس نوجوان سے کہا:

"برخوردار جب تم کتابیں پڑھنے نہیں آتے تو پھر رجسٹر ناظرین میں دستخط کیوں کرتے ہو؟"

اس نے کہا "حضور والا! ہم لوگ رجسٹر ناظرین میں اس لئے دستخط کرتے ہیں

کہ اس رجسٹر کو دیکھ کر یہ پتہ چلانے میں آسانی ہوجاتی ہے کہ ہم کس دن ملے تھے اور کس دن نہیں ملے تھے۔

جس دن لائبریری کو چھٹی ہوتی ہے اس دن ان کے عشق کی بھی چھٹی ہوتی ہے اور وہ ہجر کی گھڑیاں آہیں بھر کر کاٹ دیتے ہیں۔

لائبریری میں بھانت بھانت کے لوگ میں نے دیکھے ہیں۔ ایک صاحب ہیں جن کا قد بٹانے سے زیادہ نہیں ہے لیکن کتاب ہمیشہ اتنی ضخیم پڑھتے ہیں کہ ان کی جسامت پر رحم آنے لگتا ہے۔ وہ جب ایک ضخیم کتاب کو اٹھائے میز کی طرف آتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی ہیوی ویٹ چمپین لوہے کے گولے کو بمشکل تمام اپنے ہاتھوں پر اٹھائے چل رہا ہے۔ ایک بار ایک ضخیم سی کتاب ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر ان کے پاؤں پر گر گئی تھی اور وہ اس کے نتیجے میں کئی دنوں تک لنگڑاتے پھرے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لئے انسان کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کی یہ ادنیٰ سی مثال ہے۔

ایک کاروباری ناظر ہیں جو لائبریری صرف اسی لئے آتے ہیں کہ کچھ پیسہ کمایا جائے۔ یہ صاحب ایک دن پہلے میز پر پڑھی جانے والی ساری ضخیم کتابوں کو نوٹ کر لیتے ہیں۔ انھیں معلوم رہتا ہے کہ ناظرین یہ کتابیں ایک دن میں ختم نہیں کر سکتے۔ سو دوسرے دن وہ سب سے پہلے لائبریری میں پہنچ جاتے ہیں اور ان ساری کتابوں کو اپنے سامنے جمع کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب ان کتابوں کے ناظرین دوسرے دن آتے ہیں تو انھیں بے حد افسوس ہوتا ہے کہ ان کی کتاب کوئی دوسرا ناظر لے گیا ہے۔ اب پرانے ناظرین اس کتاب کی تلاش میں ان صاحب کے پاس آتے ہیں اور کتاب کی واپسی کے لئے منت سماجت کرنے لگتے ہیں۔ تب یہ صاحب حسب استطاعت ناظرین سے چار پانچ آنے بطور معاوضہ

وصول کر لیتے ہیں اور یوں دن بھر کی کمائی اپنی جیب میں ڈال کر گھر کو واپس ہو جاتے ہیں۔

ایک دن میں نے ایک صاحب کو دیکھا جو لائبریری کے ایک کارکن سے بار بار پوچھ رہے تھے "کیا آپ کے ہاں سلمان ارشد کی کوئی کتاب ہے؟" اور کارکن انھیں بار بار سمجھا رہا تھا کہ "صاحب' ہمارے ہاں سلمان ارشد کی کوئی کتاب نہیں ہے۔"

اس پر ان صاحب نے جھنجھلاتے ہوئے کہا" تعجب ہے کہ آپ کے ہاں سلمان ارشد کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ آپ کی لائبریری سلمان ارشد کی کتابوں کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتی ہے، آپ کو اسی وقت اس کی کتابیں منگوانی چاہئیں۔"

ان کی گفتگو سن کر میں نے سوچا کہ سلمان ارشد ضرور کوئی بڑا ادیب ہوگا جبھی تو یہ صاحب اس کی کتابوں کے بارے میں بار بار پوچھ رہے ہیں۔ اس پر میں قدرے تجسس کے ساتھ ان کے قریب گیا اور پوچھا:

"گستاخی معاف! یہ سلمان ارشد کون ہیں؟"

وہ صاحب قدرے شرماتے ہوئے بولے: "جی! میں ہی سلمان ارشد ہوں، کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا: "آپ کو اپنی خدمت سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے جو آپ میری خدمت کر سکیں۔" تب وہ قدرے جھینپ کر لائبریری سے باہر چلے گئے۔

اب آپ ایک اور ناظر صاحب سے ملیے جنھوں نے لائبریری کی کتابوں کو برہنہ اور خوبصورت تصویروں سے پاک کرنے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔ یہ صاحب لوگوں کی نظریں بچا کر کتابوں میں سے برہنہ تصویریں نکال لیتے ہیں۔ ایک دن میں نے انھیں ایک کتاب سے برہنہ تصویر نکالتے ہوئے پکڑ لیا تو انھوں نے نہایت معصومیت کے ساتھ

مجھ سے کہا : " قبلہ ! یہ جو تصویریں نکال رہا ہوں وہ نہایت عریاں ہے اور کتاب میں اس کے موجود رہنے سے قارئین کے اخلاق پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے، لہذا میں خدمتِ خلق کے طور پر اس کو کتاب سے علیٰحدہ کر رہا ہوں "۔

میں نے کہا : " مگر اس تصویر سے آپ کے اخلاق پر بھی تو بُرا اثر پڑ سکتا ہے "۔

اس پر وہ بولے : " آپ میری فکر نہ کریں، میرے اخلاق پہلے ہی سے اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ ان میں اب مزید بگڑنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے "۔

غرض پیارے ناظرین ! مجھے لائبریری میں چند گھنٹے گزار کر بڑا آرام ملتا ہے، دل کو بڑا سکون میسّر آتا ہے۔ اسی لئے تو میں نے یہ اصول بنا رکھا ہے کہ جب میرے پاس ہوٹل میں چائے پینے کے لئے پیسے نہیں ہوتے، جب میں زندگی سے بیزار ہو جاتا ہوں اور جب بیوی سے میری لڑائی ہو جاتی ہے اور جب قرض خواہ میری تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں تو میں چپ چاپ لائبریری چلا جاتا ہوں اور اپنا غم غلط کر لیتا ہوں۔ اگر آپ پر بھی کبھی ایسا وقت آئے تو ضرور لائبریری چلے جائیے، انشاء اللہ آپ کی مشکلات بھی دُور ہو جائیں گی۔ بس ایک بار آزمائش شرط ہے۔

سڑک اور شاعر

سڑک اور شاعر کا رشتہ اتنا ہی پُرانا ہے جتنا کہ بے ایمانی اور تاجر کا رشتہ!
شاعر زندگی بھر سڑکیں ناپتا ہے اور بالآخر سڑکیں ہی شاعر کو ناپ لیتی ہیں۔ پھر اخباروں میں خبر چھپتی ہے کہ ملک کے ممتاز شاعر حضرت طویل بحر وی ایک سڑک کے کنارے مُردہ حالت میں پائے گئے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوی اور ایک سڑک چھوڑی ہے خُدا ان دونوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین ثم آمین۔
اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ شاعر ہمیشہ سڑکوں پر پایا جاتا ہے ۔ سڑکوں پر شعر کہتا ہے، سڑکوں پر مشاعرے برپا کرتا ہے اور اگر مشاعرے برپا نہیں کرتا تو ہر چلنے والے کو پکڑ پکڑ کر ایک شعر ہی سنا دیتا ہے۔ ادب کا بڑے سے بڑا مسئلہ سڑکوں پر ہی حل ہوتا ہے۔ غرض شاعر اور سڑک کا رشتہ بہت قدیم ہے۔
ہم ایک شاعر دوست سے واقف ہیں جنھوں نے اپنی ساری نظمیں سڑکوں پر چلتے

چلتے کہی ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ سڑک ختم ہو جاتی ہے مگر ان کی نظم ختم ہونے نہیں پاتی۔ لہٰذا ایک سڑک پر نظم کا ایک بند کہہ لیتے ہیں تو دوسرا بند کہنے کے لیے دوسری سڑک پر نکل پڑتے ہیں۔ ایک بار انھوں نے ہمیں اپنی ایک مختصر ترین نظم سُنائی، ہم نے کہا: " بھئی تم نے بہت دنوں کے بعد ایک مختصر نظم کہی ہے۔"

وہ بولے: "جی ہاں، میں نے یہ نظم ایک مختصر سی گلی میں چلتے ہوئے کہی ہے۔ پس میری نظم کے اختصار کو نظم کا اختصار نہ کہو بلکہ اسے گلی کے اختصار پر محمول کرو۔"

اب تو سڑکوں اور ان کی نظموں کا تعلق اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ وہ صرف نظم کہہ دیتے ہیں اور سننے والے پہچان لیتے ہیں کہ انھوں نے یہ نظم کونسی سڑک پر ٹھوکریں کھا کھا کر کہی ہے۔ ایک بار تو حد ہو گئی، انھوں نے ایک مشاعرہ میں کوئی غزل سنائی اور ایک سامع نے اُٹھ کر کہا " قبلہ! آپ نے یہ غزل ضرور میکلوڈ روڈ پر چل کر کہی ہے۔"

شاعر صاحب پریشان ہو کر بولے: " آپ نے یہ کس طرح پتہ چلایا؟"

سامع بولا: " یہ بہت آسان بات ہے، کیونکہ اس غزل میں ہمیں جا بجا کوڑا کرکٹ نظر آرہا ہے، ہر طرف گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا مطلع اتنا ہی گرد آلود ہے جتنی کہ میکلوڈ روڈ گرد آلود ہے۔ پھر اس غزل کے مقطع کو سننے تک ہم لوگ اتنا ہی تھک چکے ہیں جتنا کہ اس سڑک کو پار کر کے تھک جاتے ہیں۔"

ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اب دوست حضرات، شاعر اور سڑک کے تعلق کو سمجھنے لگے ہیں اور اب مختلف شہروں سے ایسی خبریں ملنے لگی ہیں کہ وہاں کی ادبی انجمنوں نے سڑکوں کو شعراء کے نام سے معنون کرنے کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ لکھنؤ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ یہاں صرف ایک سڑک میر صاحب کے نام پر رکھی گئی ہے حالانکہ میر صاحب اُردو کے بڑے شاعر تھے اس لئے صرف ایک سڑک پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا کیا یہ ممکن نہیں کہ لکھنؤ میں میر کو دو تین اچھی سی سڑکیں الاٹ کی جائیں۔ حیدرآباد سے

کوئی ادبی انجمن یہ مطالبہ کرتی ہے کہ جگر صاحب ایک بار فلاں روڈ سے گزرے تھے پس اسی قصور میں اس سڑک کو جگر صاحب کے نام سے معنون کیا جائے۔ الٰہ آباد سے کوئی صاحب یہ کہتے ہیں کہ ایک بار مجاز لکھنوی نے وہاں کی ایک سڑک پر ٹھوکر کھائی تھی پس اسی بات پر اس سڑک کا نام مجاز روڈ رکھا جائے۔ اس پر الٰہ آباد کے مقامی شعراء چیخ اٹھتے ہیں کہ "صاحب! مجاز صاحب تو لکھنؤ کے رہنے والے تھے پس ان کے نام کی سڑک لکھنؤ میں ہی ہونی چاہئے۔ اگر الٰہ آباد کی سڑکیں بھی مجاز صاحب کے حوالے کر دی جائیں تو مقامی شعراء کا کیا ہوگا؟ آخر ہماری سڑکیں کہاں بنیں گی؟ " بھئی! جس شہر میں کسی شاعر کو اس کی شاعری کا صلہ نہ ملے تو وہاں جھک مارنے سے کیا فائدہ؟" کوئی صاحب کہتے ہیں کہ حضرت ترنم طبلوی نے فلاں سڑک پر تڑپ تڑپ کر دم توڑا تھا لہٰذا اس سڑک کو انہی کے نام سے معنون کیا جائے تاکہ ان کی روح کو تسکین پہنچے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر سڑکیں کسی شاعر کی عظمت اور قادر الکلامی کو جانچنے کی کسوٹی بن جائیں تو ادب میں ایک نیا رجحان پروان چڑھے گا۔ اگر ایک شاعر کسی اجنبی سے اپنا تعارف کرائے کہ قبلہ میں اردو کا شاعر ہوں، اب تک میرے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں تو اجنبی کہے گا: "جنابِ والا! مجموعوں کی بات چھوڑیئے، پہلے یہ بتائیے کہ آپ کی کتنی سڑکیں ہیں؟ آپ چاہے دس مجموعے شائع کروالیں، لیکن آپ کے پاس جب تک ایک سڑک نہ ہوگی اس وقت تک میں آپ کو شاعر ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

اور شاعر اس جواب پر دنگ رہ جائے گا۔ پھر زمانۂ قدیم میں جس طرح پنج ہزاری اور ہفت ہزاری منصب دار ہوا کرتے تھے اسی طرح شعراء بھی پنج سڑکی، ہفت سڑکی ہوا کریں گے اور کسی مشاعرے میں یوں اعلان کیا جائے گا کہ اب ملک کے ممتاز شاعر حضرت مائل پندرہ سڑکی اپنے کلام سے آپ کو محظوظ کریں گے۔" پھر کسی شاعر کے کلام کو

"بذریعہ سڑک" جانچنے کی وبا اتنی عام ہوجائے گی کہ اگر کسی نے آپ سے کہہ دیا کہ :

" بھئی! انشاء روڈ جاکر ایک کلو گندم لے آنا ." تو اس پر آپ کہیں گے : "جناب! معاف کیجئے مجھے انشاء کا کلام مطلق پسند نہیں لہذا میں انشاء روڈ پر نہیں جاؤں گا اس کام کے لئے انشاء کے کسی مداح کی خدمات حاصل کیجئے ."

بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو کسی شاعر کی سڑک پر چل کر اس کے کلام کا اندازہ لگالیں گے۔ مثلاً" آپ سے کوئی پوچھے کہ" مصحفی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟" تو آپ کہیں گے : "مصحفی کے کلام سے میری واقفیت صرف اتنی ہے کہ ایک بار میں مصحفی روڈ سے گزرا تھا اور جملہ چار ٹھوکریں کھائی تھیں، بس جس شاعر کی سڑک پر میں نے اتنی ٹھوکریں کھائی ہوں اب اس کے کلام کو پڑھ کر مزید ٹھوکریں کھانا نہیں چاہتا ."

اس سلسلہ میں ہماری ایک تجویز یہ ہے کہ شعراء کے نام پر رکھی جانے والی سڑکیں خود ان شعراء کے آبائی شہروں میں واقع ہوں تو اچھا ہے، ورنہ بڑی غلط فہمیوں کے پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ فرض کیجئے، کوئی صاحب حیدرآباد آتے ہیں اور آپ انھیں شہر کی سیر کرانے کے لئے لے جاتے ہیں۔ ایک مقام پر وہ پوچھتے ہیں : "بھئی یہ سڑک کونسی ہے ؟" آپ کہتے ہیں "یہ جگر مرادآبادی روڈ ہے ." اس پر وہ دنگ ہوکر کہیں گے : " بھئی سائنس کی ترقی کے کیا کہنے کہ مرادآباد کی ایک روڈ حیدرآباد سے بھی گزرتی ہے . بھئی واہ جواب نہیں ."

پھر ہماری تجویز یہ بھی ہے کہ زندہ شعراء کے نام زندہ سڑکیں الاٹ نہ کی جائیں. فرض کیجئے ایک سڑک حضرت غلام گردشوی کے نام معنون کی جاتی ہے، پھر خدا کا کرنا یہ ہوتا ہے کہ ایک دن حضرت غلام گردشوی خود اس سڑک سے گزرتے ہیں اور ایک موٹر از راہِ کرم انھیں اپنی ٹکر کا نشانہ بنالیتی ہے . اس پر دوسرے دن اخباروں میں یوں

خبر چھپتی ہے کہ : " حضرت غلام گردشوی کل شام غلام گردشوی روڈ پر ایک ٹریفک ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئے۔ مرحوم کو زمانہ کی گردش نے پھنسا رکھا تھا، مگر حضرت غلام گردشوی اتنے خود دار نکلے کہ اپنی موت کے لئے کسی دوسرے شاعر کی سڑک کا انتخاب نہیں کیا بلکہ خود اپنی ہی سڑک پر جان دے دی۔ ایسے لوگ اب اس دنیا میں کہاں باقی ہیں۔ ایک حضرت غلام گردشوی تھے سو قدرت نے انھیں بھی سڑک سے اُٹھالیا

سب سے آخر میں ہماری استدعا یہ ہے کہ شعراء کے نام سڑکیں ضرور الاٹ کی جائیں مگر سڑکوں کو الاٹ کرتے وقت ان شعراء کے کلام اور سڑک میں مماثلت و مشابہت کا خیال رکھا جائے۔ مثلاً حضرت جوش ملیح آبادی کے نام جو سڑک الاٹ کی جائے اس پر جا بجا کھڈ پڑے ہوئے ہوں، نشیب و فراز کا یہ عالم ہو کہ جب آدمی اس پر چلے تو خواہ مخواہ اس میں جوش پیدا ہو، خون کا دوران بڑھ جائے، اور اس میں ایک انقلابی اسپرٹ پیدا ہو تاکہ راہرو کو کم از کم یہ تو معلوم ہو کہ وہ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی سڑک پر چل رہا ہے۔

میراجی کے نام پر جو سڑک رکھی جائے وہ سڑک تو ہو مگر اس پر صفائی کا بندوبست نہ ہو بلکہ جگہ جگہ موریوں سے پانی اُبل رہا ہو اور جا بجا کوڑا کرکٹ کے انبار لگے ہوں۔

حضرت فراق گورکھپوری کی سڑک کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ حد سے زیادہ طویل ہو تاکہ راہرو کو معلوم ہو سکے کہ حضرت فراق سہ غزلہ، پانچ غزلہ، سولہ غزلہ کہتے ہیں۔ پھر اس سڑک پر دو رویہ سایہ دار درخت لگوائے جائیں تاکہ راہرو جب چلتے چلتے تھک جائے تو تھوڑی دیر سستانے کے لئے ان درختوں کے نیچے بیٹھ جائے۔ پانی پئے اور تازہ دم ہو کر جادۂ فکر و فن پر گامزن ہو جائے۔

حضرت فانی کی سڑک ایسی ہو جس پر چل کر انسان میں ان کے "فلسفۂ غم" کو

سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ سب سے پہلے اس سڑک کے "مین ہول" کھلے رکھے جائیں، تاکہ آدمی جب چلتے چلتے کسی مین ہول میں گرے تو اس پر یہ واضح ہو کہ فانی کا غم کتنا گہرا اور شدید تھا۔ پھر یہ سڑک ایسی ہونی چاہئے کہ اس پر انسان چلے تو کم از کم پندرہ ٹھوکریں کھا بیٹھے، کیونکہ زندگی میں ٹھوکریں کھائے بغیر غم کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔

غالب روڈ کی یہ خصوصیت ہونی چاہئے کہ اس کے ایک طرف میخانہ اور دوسری طرف ساہوکاروں کے گھر آباد ہوں تاکہ آدمی سڑک کے ایک کنارے سے قرض لے اور دوسرے کنارے جا کر اس رقم کو شراب کی نذر کر دے۔

ہمارے کہنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ شعراء کو سڑکیں الاٹ کرتے وقت ان کے کلام کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے مگر مشکل یہ ہے کہ اردو نے اتنے سارے شعراء پیدا کیے ہیں کہ محکمۂ تعمیرات تا قیامت اتنی سڑکیں تعمیر نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے درجہ کے شعراء کے لئے گلیاں الاٹ کی جائیں گی اور جب گلیوں سے بھی کام نہ بنے تو فٹ پاتھوں کی باری آئے گی۔ ایک سڑک کا دایاں فٹ پاتھ ایک شاعر کے قبضۂ قدرت میں ہوگا تو بایاں فٹ پاتھ دوسرے شاعر کے زیرِ نگیں ہوگا۔ اور پھر ایک دن وہ بھی آئے گا کہ ایک ہی سڑک دو گز تک تو "جگر روڈ" کہلائے گی مگر دو گز سے چار گز تک "فراق روڈ" بن جائے گی۔ اور جب چار گز سے آٹھ گز تک بڑھے گی تو "جوش روڈ" کہلائے گی اور اس روڈ کا سلسلہ متاخرین سے متقدمین تک جا پہنچے گا۔ پھر اردو شعراء کے مجموعہ ہائے کلام تو نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے البتہ جا بجا ان کی سڑکیں ضرور نظر آ جائیں گی۔

"کتنے پابندِ وقت ہیں ہم!"

بہت دنوں کی بات ہے کہ ہمیں اپنے ایک دوست کو وداع کرنے کے لئے طیران گاہ جانا پڑا تھا۔ طیارہ ٹھیک آٹھ بجے بمبئی کے لئے روانہ ہونے والا تھا اور ہم ٹھیک ساڑھے سات بجے ایک بس میں سوار ہوئے۔ اس حسابی مفروضہ کے ساتھ کہ اگر ایک بس تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتی ہے تو وہ طیران گاہ تک کا دس میل کا فاصلہ یقیناً آدھے گھنٹے میں طے کرلے گی لیکن آپ یقین کریں یا نہ کریں اس بس کو دھکے دے دے کر اسٹارٹ کروانے ہی میں پندرہ منٹ ضائع ہوگئے اور بقیہ جو پندرہ منٹ بچ رہے تھے وہ بس کے مختلف اسٹاپ پر رُکنے اور مسافروں کے چڑھنے اور اُترنے میں ضائع ہوگئے۔ ہم نے جب اپنی عمرِ عزیز کے قیمتی لمحات کو یوں ضائع ہوتے دیکھا تو ڈرائیور سے خواہش کی کہ "جنابِ والا! کیا آپ اس سے زیادہ تیز نہیں چل سکتے؟" اس پر وہ بولا: قبلہ! میں تو اس سے زیادہ تیز چل سکتا ہوں لیکن مشکل

یہ ہے کہ جب بس کسی اسٹاپ پر رکتی ہے تو مجھے بھی بس کے ساتھ رک جانا پڑتا ہے۔" ڈرائیور کا یہ معقول جواب سن کر ہم نے اپنی کلائی سے گھڑی اتاری اور اسے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور جب یہ بس رکتے رکاتے، گاتے بجاتے، کھیلتے کودتے طیران گاہ پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ ہمارے دوست کا طیارہ نہ صرف روانہ ہو چکا ہے بلکہ بفضلِ تعالیٰ بمبئی کی طیران گاہ پر بھی اتر چکا ہے۔

اس واقعہ کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ وقت کی پابندی کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ آپ کے وقت پر سینکڑوں افراد نے قبضہ کر رکھا ہے۔ آپ کے وقت پر اس بس نے قبضہ کر رکھا ہے جو پندرہ منٹ کی دھکم پیل کے بعد اسٹارٹ ہوتی ہے پھر آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحہ پر وہ مسافرین سوار ہیں جو بظاہر صرف بس میں سوار ہو رہے ہیں۔ آپ کا وقت اس ٹریفک کانسٹیبل کی مٹھی میں بند ہے جو صرف اسٹاپ کی تختی دکھا کر آپ کی زندگی میں سے پانچ منٹ یوں نچوڑ لیتا ہے جیسے آپ لیموں کا رس نچوڑتے ہیں۔ اور جب آپ اپنے وجود کو پانچ منٹوں کے بوجھ سے ہلکا کر کے آگے بڑھتے ہیں تو تب بھی وہ کہتا ہے: "صاحب! ذرا موٹر آہستہ لے جائیے، ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" لیکن اسے کون سمجھائے کہ اس نے ہمیں پانچ منٹ روک کر ہمیں موت سے پانچ منٹ قریب لے جا کر کھڑا کر دیا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب کہ ہم وقت کے بڑے پابند تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آتش جوان بھی نہیں ہوا تھا۔ ہماری پابندیٔ وقت اتنی مشہور تھی کہ لوگ ہماری سرگرمیوں کو دیکھ کر اپنی گھڑیوں کا وقت ملا لیا کرتے تھے مثلاً ہمیں ادھر چھینک آئی تو لوگوں نے ادھر اپنی گھڑیوں میں آٹھ بجا لیے۔ ہم نے جماہی لی تو لوگوں نے نو بجا لیے۔ ہم نے انگڑائی لی تو گھڑی کے کانٹے بھی انگڑائی لے کر بارہ کے ہندسے پر ٹھہر گئے۔ ہم نے سڑک پر ٹھوکر کھائی تو لوگوں نے ۹ بجا لیے اور اگر ہم کبھی ٹھوکر کھا کر

سڑک پر گر پڑے تو لوگوں نے کیلنڈر تبدیل کر ڈالے۔ چنانچہ آج بھی بعض نا عاقبت اندیش لوگ ہماری سرگرمیوں کو دیکھ کر اپنی گھڑیوں کا وقت ملا لیتے ہیں۔ لیکن یہ وقت ہمیشہ غلط ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ گھڑیاں بلا وجہ گھڑی سازوں کے پاس بغرض درستگی چلی جاتی ہیں۔

اب ہمارے لئے پابندیِ وقت اس لئے مشکل ہے کہ ہمارے سوائے اس دنیا میں کوئی بھی وقت کی پابندی کرنا نہیں چاہتا۔ ہم صبح چھ بجے بیدار ہونا چاہتے ہیں، لیکن ہمیں تو بیدار ہونے کے بعد چائے کی ضرورت ہوتی ہے اور چائے کے لئے دودھ کا ہونا ضروری ہے۔ گوالن کے لیے کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ صبح چھ بجے ہمارے لئے دودھ لے آئے۔ اور وہ چھ بجے دودھ کیونکر لے آئے گی جبکہ اتنی علی الصبح تو نل بھی نہیں کھلتے۔ سات بجے صبح نل کھلیں گے تو گوالن دودھ نچوڑے گی، پھر ساڑے سات بجے اس میں پانی ملائے گی، آٹھ بجے دودھ کی بالٹی لے کر اپنے گھر سے نکلے گی اور جب مختلف گھروں کے پھیرے لگاتی ہمارے درِ غربت پر پہنچے گی تو گھڑی نو بجا رہی ہوگی۔ ہم تو چھ بجے اُٹھنے کے خواہشمند ہیں، لیکن محض گوالن کی خاطر ہمیں اپنی عمرِ عزیز کے تین گھنٹے بستر میں سو کر گزارنے پڑتے ہیں اور ایک معمولی گوالن جب ہمارے چوبیس گھنٹوں میں سے تین گھنٹوں پر قبضہ کر سکتی ہے تو دوست احباب چوبیس گھنٹوں میں سے اڑتالیس گھنٹوں پر قبضہ کرنے میں یقیناً حق بجانب ہیں۔ ہم کس منہ سے وقت کا پابند بننے کی کوشش کریں ۔۔۔ ؟

اب آپ سے کیا بتائیں کہ ہماری شادی میں محض قاضی صاحب کی تاخیر سے آمد نے ہماری ازدواجی زندگی کے دو گھنٹے مستقلاً کم کر رکھے ہیں۔ انہی دو گھنٹوں کی تاخیر کے باعث ہم اپنی بیوی کے ساتھ اب وہ دو گھنٹے کبھی نہ گزار سکیں گے جو گزارے جا سکتے تھے۔ لیکن گزارے نہ گئے۔ غور فرمایئے تو ان دو گھنٹوں کا خسارہ ہماری ازدواجی زندگی کا ایک

لازمی جزو بن گیا ہے۔ کیونکہ ہمیں ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ اگر قاضی صاحب نے تاخیر نہ کی ہوتی تو ہم دو گھنٹے پہلے ہی اپنی بیوی سے مل سکتے تھے۔ پھر دو گھنٹے پہلے ہی زندگی میں صاحب اولاد بن جاتے اور پھر عمر کے آخری حصہ پر پہنچ کر دو گھنٹے بعد اپنی بیوی سے رخصت ہوتے۔ بہرحال مستقبل میں جب کبھی ہم اپنی بیوی سے رخصت ہوں گے تو یہ قلق رہے گا کہ کاش ہم مزید دو گھنٹے اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ گزار سکتے۔

سچ پوچھیے تو ہم نے جب بھی وقت کا پابند بننے کی کوشش کی تو ہم پر بُرا وقت آن پڑا۔ اور آج ہم سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے وقت کا پابند بننے کی کوشش میں وقت کو بے دریغ خرچ نہ کیا ہوتا تو آج ہم بھی کچھ کام کے آدمی ہوتے ؎

وقت نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہمیں یاد ہے کہ ہم نے میٹرک کے امتحان کی تیاری کے لئے جو ٹائم ٹیبل مرتب کیا تھا وہ خود ایک مہینہ کی لگاتار محنت و جانفشانی کے بعد تیار ہوا تھا۔ اور جب امتحان قریب آیا تو پتہ چلا کہ جب تک ہماری عمر ۱۶ سال نہیں ہو پاتی اس وقت تک ہم امتحان میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد سے پابندیٔ وقت سے اتنی نفرت ہو گئی کہ زندگی میں "انٹرمیڈیٹ کی بس" دو سال لیٹ پہنچی اور بی اے کا امتحان تو مکمل تین سال تک امتحان میں نقل مارنے کے بعد کامیاب کیا۔

لیکن اب ہمیں وقت کی پابندی کا خیال اس لیے نہیں آتا کہ ہم نے، ہم سے کہیں بڑے "بے نیازانِ وقت" دیکھے ہیں۔ مثلاً ہم ایک دن اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے سہ پہر میں ساڑھے تین بجے ان کے دفتر پہنچے۔ چپراسی سے پوچھا تو وہ بولا:

"حضور! صاحب موجود نہیں ہیں، کیونکہ وہ ذرا دیر سے دفتر آتے ہیں۔"

بھلا بتائیے، ساڑھے تین بجے دفتر آنے کو کیا "ذرا دیر سے دفتر آنا" کہتے ہیں۔ اس پر

ہم نے کہا " اچھا جب تمہارے صاحب آئیں تو کہہ دینا کہ ہم تھوڑی دیر سے پھر آئیں گے"۔ اس کے بعد ہم تھوڑی دیر تک ایک ہوٹل میں بیٹھ کر اپنا وقت برباد کرتے رہے۔ اور جب ساڑھے چار بجے دوبارہ اپنے دوست کے دفتر پہنچے تو چپراسی بولا :

" حضور! صاحب تو آئے تھے لیکن آپ نے کافی دیر لگادی۔ کیونکہ وہ تو دفتر سے ذرا جلدی گھر واپس جاتے ہیں"۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم وقت کی پابندی کریں تو کیونکر کریں ؟

ایسے موقعوں پر ہمیں اپنی بیٹی راشدہ کا ایک جملہ یاد آتا ہے۔ ہوا یوں تھا کہ ہم ایک دن بیٹی کو" وقت کی اہمیت" کا سبق پڑھا رہے تھے۔ ہم نے اسے سمجھانے کے لئے کہا :

" بیٹی! گراہم بیل کو تم نہیں جانتیں، وہ ٹیلیفون کا موجد تھا۔ وہ وقت کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور وقت کی پابندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ایک دن ٹیلیفون ایجاد کرلیا۔ بس بیٹی تمہیں بھی وقت کی قدر کرنی چاہئے"۔

ہماری نصیحت کو سن کر راشدہ نے پٹاخ سے کہا :

" اباجان! اب میں وقت کی پابندی کر کے کیا کروں جبکہ گراہم بیل نے ٹیلیفون ایجاد کر کے میرے لئے ٹیلیفون کو دوبارہ ایجاد کرنے کا کوئی موقع نہیں رکھ چھوڑا ہے۔ بس اسی بات پر مجھے اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دیجئے"۔

راشدہ کا یہ جملہ ہمارے دل پر نقش ہے اور سچ پوچھئے تو ہم اسی کے سہارے اپنی ساری زندگی کو ضائع کر رہے ہیں۔ اب تو ہم نے اپنے ہاتھ پر گھڑی لگانی بھی چھوڑ دی ہے، کیونکہ ہم جدید فیشن کے سخت مخالف ہیں۔ البتہ گھڑی سازوں سے ضرور یہ عرض کریں گے کہ قبلہ! جب فیشن کی خاطر گھڑیاں بنانا ہی مقصود ہے تو ان میں منٹوں اور گھنٹوں

کے کانٹے لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی بجائے اگر ڈائیل میں کسی خوبرو اداکارہ کی تصویر لگادی جائے تو وقت کافی آسانی سے کٹ سکے گا۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کے پاس اب منٹوں اور گھنٹوں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے وقت کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ مثال کے طور پر پرسوں ایک صاحب نے ہم سے پوچھا:

"صاحب، آج کونسی تاریخ ہے؟"

ہم نے کہا "آج آٹھ تاریخ ہے۔"

بولے: "کونسے مہینے کی آٹھ تاریخ ہے؟"

ہم نے کہا: "اگست کے مہینے کی۔"

انھوں نے پوچھا: "اگست کا مہینہ کونسے سن کا؟"

ہم نے کہا: "سنہ ۶۴ کا اگست۔"

بولے: "کونسی صدی کا ۶۴ واں سن؟"

ہم نے کہا: "بیسویں صدی کا ۶۴ واں سن۔"

اس پر ان صاحب نے ہمارا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "معاف کیجئے، میں نے آپ کا کافی وقت ضائع کیا ہے۔" غرض جب لوگوں کو صدیوں میں پھیلے ہوئے وقت کی کوئی قدر نہیں تو پھر وہ منٹوں اور گھنٹوں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے وقت کی کیا قدر کریں گے؟

بہرحال وقت ایک ایسا معمہ ہے جو ہمارے وجود کو بڑھا بھی رہا ہے اور گھٹا بھی رہا ہے اور وقت کی اسی چالاکی کے سلسلے میں شاعر نے عاجز آکر کیا خوب کہا تھا:

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے۔

اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

ایڈیٹر کے نام

ادیبوں کے پریم پتر

پروفیسر فرحت ایم اے

ڈیر مسٹر ایڈیٹر!

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ اور خیریت سے اس لئے بھی ہوں گے کہ گزشتہ چھ ماہ سے آپ کا رسالہ بڑی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اگر آپ خیریت سے نہ ہوتے تو رسالہ اس قدر پابندی سے کیونکر شائع کر سکتے۔ کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ کے رسالے کے لئے کچھ نہ کچھ لکھوں، کیونکہ مجھے آپ کا رسالہ بہت پسند ہے۔ چنانچہ جب بھی سودا سلف خریدنے بازار جاتا ہوں تو دکاندار سے کہہ دیتا ہوں کہ:

"میاں، خشخاش، زیرہ، دھنیہ، غرض ہر شئے آپ ہی کے رسالے کے اوراق میں باندھی جائے۔"

اگر کبھی اس کے پاس پڑیاں باندھنے کے لئے آپ کے رسالے کے اوراق نہیں ہوتے تو دوسری دکان سے سودا خریدتا ہوں۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مجھے آپ کے رسالہ سے

کس قدر پیار ہے اور اسی پیار کا نتیجہ ہے کہ میرا دکاندار اب صرف میرے گھر کا سودا سلف باندھنے کے لئے آپ کے رسالے کا مستقل خریدار بن گیا ہے۔ چنانچہ وہ صفحات کے تسلسل کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف اشیاء باندھتا ہے اور آخر میں اشیاء کی فہرست یوں مرتّب کرتا ہے:

صفحات ایک تا دو : دھنیہ ایک چھٹانک
زیرہ دو چھٹانک

ملاحظہ ہو صفحات ۳ تا ۴ شمارہ ۱۰ جلد ۹ : پاؤ سیر ہلدی

نوٹ: صفحات ۵ تا ۶ کے اوراق میں ہلدی اس لئے نہیں باندھی گئی کہ اس پر ایک آزاد نظم شائع ہوئی تھی۔ اس ورق کو مفادِ عامہ کے پیشِ نظر تلف کردیا گیا ہے۔"

اس تفصیلی فہرست کو لے کر گھر آتا ہوں، سامان بیوی کے حوالے کرتا ہوں اور آپکے رسالہ کے اوراقِ پارینہ کا مطالعہ شروع کردیتا ہوں۔ جب یہ صفحات ختم ہوجاتے ہیں تو بیوی سے پیسے لیتا ہوں۔ اور پھر سودا لانے کے لئے بازار چلا جاتا ہوں۔ گویا آپ کے رسالے سے میری والہانہ محبت کے باعث یہ کہنا پڑتا ہے کہ "ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں"۔

یہ تمہید میں نے اس لئے باندھی ہے کہ میں آپ کے لئے اور آپ کے رسالہ کے لئے اپنے دل میں بڑا خلوص رکھتا ہوں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ میں اپنا تازہ افسانہ آپ کی خدمت میں روانہ کررہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس افسانے کو اپنے رسالے میں جگہ دیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس افسانہ کی اشاعت کے ساتھ ہی آپ کے رسالے کی تعدادِ اشاعت میں پچاس نسخوں کا اضافہ ہوگا۔ کیونکہ یہ پچاس نسخے میں خود خریدوں گا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کے پاس روانہ کروں گا تاکہ وہ مستقبل میں میرا احترام کرنے لگیں۔

نیاز بے نیازی بی۔اے۔ال ال۔بی

ادب کے بے تاج بادشاہ!

یہ بندہ آپ کی خدمت میں ایک افسانہ "فرسٹ اِن فرسٹ" روانہ کر رہا ہے اس افسانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر اعتبار سے "فرسٹ اِن فرسٹ" ہے۔ بلحاظ عنوان اور بلحاظ متن میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ اس افسانے کو اُردو ادب میں کئی اعتبار سے اولین اہمیت حاصل ہوگی۔ مثلاً یہ میرا پہلا افسانہ ہے جو پہلی مرتبہ میرے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ اس افسانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیک وقت ۲۰۰ کردار موجود ہیں جن میں سے چالیس فیکٹری مزدور ہیں، دو سپروائزر ہیں، ایک منیجر ہے، چالیس سیلس گرلز، پندرہ گھوڑے، پندرہ گھڑسوار، دو بندر، چار کتے، ایک عدد طوطا (خورد) ایک عدد طوطا (کلاں) ایک دھوبی، ایک حجام، ایک سیاسی لیڈر، دو سماجی کارکن، اور باقی متفرق کردار ہیں۔ آپ کی نظر سے صرف چار صفحات پر مشتمل ایسا افسانہ نہ گزرا ہوگا جس میں بیک جنبشِ قلم ۲۰۰ کردار ٹھونسے گئے ہوں۔ گویا افسانہ کیا ہے، ایک اچھی خاصی بس ہے جس میں اتنے سارے کرداروں کو بند کر دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بڑے سے بڑے ناول میں بھی کسی نے اتنے سارے کرداروں کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ اگر کی بھی ہوگی تو کوئی نہ کوئی کردار نظر بچا کر بھاگ گیا ہوگا۔ یہ تو صرف میری فن کارانہ چابکدستی کی دلیل ہے۔ چابکدستی اس لیے کہ اس افسانے میں پندرہ گھوڑے بھی ہیں جو بار بار افسانے کے پلاٹ سے بھاگ جانے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن میں نے ایسی چابکدستی دکھلائی اور وہ چابک رسید کیے کہ راہِ راست پر آگئے اور دُلکی چال چلنے لگے جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ اُردو کا واحد مختصر افسانہ ہے جس میں ۲۰۰ کردار موجود ہیں، اور اس اعتبار سے اُردو ادب کا یہ پہلا افسانہ ہے جسے پڑھنے کے بعد قاری کو یہ احساس ہوگا کہ ہمارے ملک کی آبادی کس قدر بڑھ گئی ہے۔ آبادی میں اضافے کے

موضوع پر بھی غالباً یہ پہلا افسانہ ہے۔ اب آپ اس افسانے کو شائع کریں تو آپ کا رسالہ بھی غالباً ملک کا پہلا رسالہ ہوگا جسے ایسا عجیب الخلقت افسانہ شائع کرنے کا شرف حاصل ہوگا۔

اُمید ہے کہ آپ ایسے زرّین موقع کو ضائع نہ ہونے دیں گے اور نہایت ہی قریبی اشاعت میں اسے جگہ دیں گے۔ مطلع فرمایئے کہ آپ کی سب سے قریبی اشاعت کتنے مہینوں بعد عمل میں آرہی ہے؟

ڈاکٹر زرین بخت کمبخت پی۔ ایچ۔ ڈی

جناب ایڈیٹر صاحب!

مجھے یہ جان کر شدید صدمہ ہوا کہ آپ اپنا رسالہ بند کر رہے ہیں اور یہ کہ آئندہ ماہ سے آپ کے رسالے کا کوئی شمارہ شائع نہ ہوگا۔ مجھے یہ صدمہ اس لئے بھی ہو رہا ہے کہ دو سال پہلے میں نے آپ کی خدمت میں جو افسانہ روانہ کیا تھا وہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اب اگر آپ کا رسالہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے تو بتایئے اب میں کہاں جاؤں، کس کا در کھٹکھٹاؤں، کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں، کس کی منت سماجت کروں۔ ہائے میں تو لُٹ گیا، تباہ ہوگیا۔ کسے معلوم تھا کہ آپ کا رسالہ عین عالم شباب میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ دے گا اور یوں مجھے یتیم و لیسیر بنا کر چھوڑ دے گا۔ اگر میرے افسانے کی اشاعت کے بعد آپ کا رسالہ دم توڑ دیتا تو کم از کم لوگوں کو یہ تو معلوم ہوتا کہ آخر رسالے کے بند ہونے کی اصل وجہ کیا تھی۔ اب یوں بیٹھے بٹھائے اس کا بند ہونا بُری طرح کھٹک رہا ہے۔ لہٰذا ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے یعنی آپ اپنے رسالہ کا ایک شمارہ بہر صورت شائع کریں جس میں میرا افسانہ شامل ہو۔ اس شمارہ کے نکالنے میں جو مصارف آئیں گے وہ میں برداشت

کروں گا۔ چنانچہ مبلغ دو سو روپے بطور پیشگی آپ کی خدمت میں بذریعہ منی آرڈر روانہ کئے جا رہے ہیں۔ افسانہ کی وصولی کی تو آپ نے کوئی اطلاع نہیں دی تھی، کم از کم منی آرڈر کی وصولی کی اطلاع ضرور دیجیے۔

اگلے شمارہ میں اپنا افسانہ دیکھنے کا متمنی :

کمبخت

راز افشا آبادی، بی اے

شریمان ایڈیٹر جی!

اگر آپ اپنا رسالہ پڑھتے ہوں تو آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ شمارہ میں میری ایک غزل شائع ہوئی تھی۔ اس کے معاوضہ کے سلسلے میں میں نے آپ سے خط و کتابت کی تھی تو پتہ چلا کہ آپ کو ادیبوں اور شعراء کو ان کی تخلیقات کا معاوضہ ادا کرنے کی عادت نہیں ہے۔ گو یہ بڑی اچھی عادت ہے لیکن اب میں آپ پر ایک راز افشا کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے معاوضہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ مجھے اپنی غزل کا معاوضہ مل چکا ہے۔ اگر آپ پوچھیں کہ مجھے یہ معاوضہ کس طرح ملا جب کہ آپ نے معاوضہ روانہ ہی نہیں کیا تو اس کے لئے آپ کو ایک داستان سننی پڑے گی۔ ہُوا یوں تھا کہ میرا ایک دوست آپ کے رسالہ کا بڑا مداح ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ آپ کے رسالہ میں کوئی غیر معیاری غزل شائع نہیں ہوتی۔ مجھے اس سے اختلاف تھا اور میں نے دعویٰ کیا تھا کہ آپ کے رسالہ میں غیر معیاری غزل بھی شائع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس بات پر میرے اور میرے دوست کے درمیان سو روپیوں کی شرط بدی تھی اور اسی شرط کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے میں نے اپنی وہ غزل روانہ کی تھی جسے یہاں کے مقامی شعراء نے تسلیم کر لیا تھا کہ یہ ایک غیر معیاری غزل ہے۔ چنانچہ وہ غزل آپ

کے رسالے میں نہ صرف شائع ہوئی بلکہ آپ نے ادارہ کی جانب سے اس پر ایک تعریفی نوٹ بھی لکھ دیا۔ اس طرح اب میں شرط جیت چکا ہوں اور مجھے اس غزل کا معاوضہ سو روپیوں کی شکل میں مل چکا ہے۔ آپ نے اس غزل کو شائع کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے کیونکہ جس مہینے کے شمارے میں یہ غزل شائع ہوئی ہے اُس مہینے میں مجھے روپیوں کی شدید ضرورت تھی۔ اور سُنائیے کیا حال ہے۔ اِدھر چند دنوں سے کسی دوست نے مجھ سے شرط نہیں بدی' ورنہ اپنی کوئی تازہ تخلیق آپ کی خدمت میں ضرور روانہ کرتا۔ مجھے اُمید ہے کہ اس معاملہ میں آپ کا تعاون مستقبل میں بھی برقرار رہے گا تاکہ میرا مستقبل تابناک ہو سکے۔ خدا حافظ۔

نوٹ:۔ میں آپ کی خدمت میں ذریعہ منی آرڈر پچاس روپے روانہ کر رہا ہوں یہ دراصل اس شرط کی نصف رقم ہے جو میں نے جیتی ہے۔ لہذا آئندہ سے اسے ایک خفیہ معاہدہ سمجھئے کہ جب بھی میں کوئی غزل روانہ کروں تو یہ "ایک غیر معیاری غزل" ہوگی جس پر میں نے شرط بدی ہے۔ آپ اسے شائع فرما دیں تو شرط کی آدھی رقم آپ کی اور آدھی میری۔ اس طرح ہم دونوں اپنے حریفوں کو اُلّو بنا کر اپنا اپنا اُلّو سیدھا کرلیں گے۔

ریاض احمد۔ پٹنہ

مکرمی ایڈیٹر صاحب!

آپ کی خدمت میں "جوتا" روانہ کر رہا ہوں (جوتا افسانے کا عنوان ہے)۔ اُمید ہے کہ آپ کے معیار کے پاؤں میں فِٹ بیٹھے گا۔ اگر آپ کے معیار کے پاؤں سے بڑا ہو تو براہ کرم اس میں ردّی ٹھونسیئے اور آئندہ اشاعت میں اس سے کام چلائیے۔ اس سے پہلے میں نے ایک "ٹوپی" بھی روانہ کی تھی جو ابھی تک شائع نہیں

ہوئی ۔ قیاس اغلب ہے کہ یہ آپ کے سَر پر سما نہیں سکی ۔ (سر میں سمانا تو الگ بات ہے) ۔ کہئیے تو سائز بدل کر ایک اور ٹوپی روانہ کر دوں ۔

قصہ مختصر، اس وقت میرا ایک عدد "جوتا" اور ایک عدد "ٹوپی" آپ کے پاس پڑی ہوئی ہے، اگر آپ انھیں شائع نہ کریں تو آئندہ مہینے "شیروانی" روانہ کروں گا ۔ دیکھیں آپ کب تک ان اشیاء کی حفاظت کر سکتے ہیں ۔ نیاز مند

ستّار جھنجھالوی

ایڈیٹر صاحب !

آپ کا تازہ شمارا ابھی ملا ہے ۔ یہ تو اتنا تازہ اور گرما گرم ہے کہ لفافہ کھولتے ہی ہاتھوں کو چر کے لگنے لگے ۔ سو اسے پڑھنے سے پہلے مجھے "ریفریجریٹر" میں رکھنا پڑا ۔ اس میں آپ نے میرا مضمون "تغزل حیدرآبادی سے ایک انٹرویو" بھی شائع کیا ہے ۔ رسالے کے ساتھ ہی آپ نے ایک خط بھی روانہ کیا ہے جس میں یہ خواہش کی گئی ہے کہ میں ایک اور غافل ادیب کو تلاش کر دوں اور اس سے انٹرویو کر کے آپ کی خدمت میں روانہ کروں ــــ

قبلہ ! آپ نے تو میری حیثیت صرف "پوسٹ مین" کی بنا رکھی ہے ۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر، اور یہ بھی درست کہ مجھے انٹرویو کے لئے کئی غافل ادیب مل سکتے ہیں لیکن میں نے انٹرویو کرنے سے توبہ کر لی ہے اور زندگی باقی رہی تو آئندہ کبھی کسی سے انٹرویو نہ کروں گا ۔ آپ کو نہیں معلوم کہ ان انٹرویوز کے باعث میری حیثیت کتنی گھٹ گیا اور کمتر ہو گئی ہے ۔ مثلاً پرسوں ہی ایک بزرگ آئے تھے، پہلے تو میرے انٹرویوز کی بڑی تعریف کرتے رہے، پھر کہنے لگے :

" اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کیا آپ مسٹر خورشید حسین ایم ایس سی کا انٹرویو

کر سکتے ہیں جو ریجنل ریسرچ لیبارٹری میں کام کرتے ہیں ؟"

میں نے پوچھا : "یہ صاحب کون ہیں، کیا کرتے ہیں، اور آپ مجھے ان سے انٹرویو کرنے پر کیوں مجبور کر رہے ہیں ؟"

اس پر وہ بزرگ شرماتے لجاتے بولے : "بھئی بات دراصل یہ ہے کہ میری بیٹی کا رشتہ ان سے طے پا رہا ہے لیکن اب تک انھوں نے اپنی اسم نویسی روانہ نہیں کی۔ اگر آپ ان سے انٹرویو کر لیں تو مجھے بآسانی پتہ چل جائے گا کہ ان کے والد کون ہیں، چچا کیا کام کرتے ہیں، کتنے بھائی ہیں، کتنی بہنیں ہیں، ان کے مشاغل کیا ہیں وغیرہ وغیرہ ـــ"

تو صاحب دیکھ لیا نا، ہماری کیا حیثیت ہوگئی ہے لوگوں کی نظر میں۔ لہٰذا میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ مجھے انٹرویوز لے لیے مجبور نہ کریں، ورنہ میں کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف نکل جاؤں گا اور پھٹے ہوئے کپڑوں کا پارسل آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔ اُمید کہ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔

شفیقہ پروین۔ لکھنؤ

ایڈیٹر بھیّا!

اے ہے کیا خوبصورت نمبر نکالا ہے آپ نے کہ دیکھتے ہی دل باغ باغ ہوگیا اور اس باغ میں جوہی کے پھول کھلنے لگے جواب تک تر و تازہ ہیں جن کی بھینی بھینی خوشبو سے میرا دماغ ابھی تک معطّر ہے۔ لیکن ایڈیٹر بھیّا، آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے میرا افسانہ اس سالنامے میں بھی شائع نہیں کیا، حالانکہ میں نے اسے پانچ سال پہلے کے "سالنامہ" کے لئے روانہ کیا تھا۔ نہ تو آپ کا کوئی "گرامی نامہ"

ملتا ہے اور نہ ہی وہ سالنامہ جس میں میری کہانی مجھے نظر آجائے۔ آپ بڑے کٹھور ہیں بلکہ بڑے وہ ہیں۔ آپ کو یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں نے وہ افسانہ کتنی محنت سے لکھا تھا۔ ہائے پانچ سال پہلے کا وہ دن اب بھی یاد آتا ہے تو آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں۔ جب میں افسانہ لکھنے میں مصروف تھی۔ اس دن میں نے کھانا تک نہیں کھایا تھا۔ گھر میں جھاڑو تک لگانا بھول گئی تھی۔ چنانچہ میرے شوہر اس دن خالی پیٹ ہی دفتر چلے گئے، بچے بھوک سے بلکتے رہے روتے رہے، چیختے چلاتے رہے۔ لیکن میں افسانہ لکھنے میں مصروف تھی۔ کیا بتاؤں کہ کیسی ریمارکیبل اسپرٹ میں وہ افسانہ لکھا تھا جسے لکھنے کے بعد میں نے اپنے گھر کے سارے نظام کو درہم برہم پایا تھا۔ لیکن آپ کو اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں۔ سچ ہے کہ مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ آپ کو اگر میرا افسانہ پسند نہیں آیا تھا تو تب بھی آپ کو کم از کم میرے شوہر پر رحم کرنا چاہئے تھا کہ میں نے انھیں اس افسانے کی خاطر خالی پیٹ ہی دفتر روانہ کر دیا تھا۔ ہائے اس دن جب وہ شام میں گھر واپس ہوئے تھے تو ان کے چہرے پر کیسی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں (ایسی ہوائیاں میں نے آج تک ان کے چہرے پر نہیں دیکھیں) سوچتی ہوں تو دل مسوس کر رہ جاتی ہوں اگر آپ کسی نہ کسی وجہ سے میرے شوہر سے رقابت محسوس کرتے ہیں تو آپ کو کم از کم ان معصوم بچوں کا خیال کرنا چاہئے تھا جنھیں روتا اور بلکتا چھوڑ کر میں افسانہ لکھنے میں مصروف تھی۔ میں نے یہ ساری باتیں اس لئے لکھی ہیں کہ آپ کے اندر انسانیت کا جذبہ بیدار ہو اور اتنا بیدار ہو کہ آپ ایک دن میرا افسانہ شائع کر بیٹھیں۔ خیر یہ میرا پریم پتر پڑھ کر تم ناراض نہ ہونا۔ فقط

آپ کی منہ بولی بہن

حیدرآباد بائی نائٹ

یونیورس بائی نائٹ، ورلڈ بائی نائٹ، پیرس بائی نائٹ، ٹوکیو بائی نائٹ کے بعد ضروری تھا کہ "حیدرآباد بائی نائٹ" کی طرف توجہ کی جائے۔ کیونکہ ان دنوں نائٹوں کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے اور کیا عجب کہ ایک دن یہ سلسلہ بڑے شہروں سے نکل کر "گرمشکال بائی نائٹ" اور "کوڑنگل بائی نائٹ" تک جا پہنچے۔ نائٹوں کا یہ سلسلہ کہاں تک جا پہنچے گا اور آیا ان راتوں کی کوئی سحر بھی ہوگی یا نہیں یہ ہم نہیں جانتے۔ ہمیں تو اس وقت "حیدرآباد بائی نائٹ" کی فکر پڑی ہے۔ اور ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ حیدرآباد میں بھی رات آتی ہے اور اتفاق سے ہر روز آتی ہے۔ یہ عموماً سورج کے غروب ہونے کے بعد آتی ہے اور خصوصاً دوسرے روز سورج کے طلوع ہونے تک برقرار رہتی ہے۔ کم از کم اس معاملے میں حیدرآباد دوسرے شہروں سے پیچھے نہیں ہے۔

پھر "پیرس کی راتوں" سے حیدرآباد کی راتیں بھی کچھ کم پیچھے نہیں ہیں۔ سُنا ہے کہ پیرس کے نائٹ کلبوں میں عریانی کے مظاہرے ہوتے ہیں اور اتفاق سے حیدرآباد کی

سڑکوں پر بھی عُریانی کے نظارے دیکھنے کو مل جاتے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ پیرس کی عریانی" امارت کی عُریانی" ہوتی ہے اور حیدر آباد کی عُریانی" غربت کی عریانی" کے زمرے میں آتی ہے ۔ وہاں لوگ امیر ہوکر عریاں ہو جاتے ہیں اور یہاں لوگ غریب ہوکر عریاں ہو جاتے ہیں ۔ ایک کو تن ڈھانکنے کپڑا نہیں ملتا اور ایک کو تن ڈھانکنے کپڑا تو ملتا ہے مگر اسے پہننے کی فرصت نہیں ملتی ۔ گویا اہلِ حیدر آباد کے لئے عریانی ایک "مجبوری" ہے اور یہی عریانی اہل پیرس کے لئے ایک فیشن ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حیدر آباد کی راتوں میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو دنیا کے دیگر شہروں کی راتوں میں ہوتا ہے مگر اس کی نوعیت ذرا مختلف ہوتی ہے ۔ ہم اپنے شخصی تجربہ کی بنا پر یہ کہنے کے موقف میں ہیں کہ حیدر آباد میں دو قسم کی راتیں ہوتی ہیں "اندھیری راتیں" اور "اُجلی راتیں"۔

اندھیری راتیں اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہوتی ہیں کہ اس شہر میں ایک محکمۂ برقی موجود ہے اور اگر راتیں اُجلی ہوں تو یہ بھی اتفاق سے اس بات کا مردہ ثبوت ہوتی ہیں کہ یہاں محکمۂ برقی بہر حال موجود ہے ۔ گویا ہر دو صورتوں میں محکمۂ برقی اپنے وجود کو منوا لیتا ہے ۔

حیدر آباد میں ابھی تک ایسے جہلا اور غیر مہذب انسانوں کی اکثریت ہے جو رات کو صرف سونے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور دن کو کام کرنے کے استعمال میں لاتے ہیں ۔ ابھی اہلِ حیدر آباد نے دنیا کے دیگر شہروں کے باشندوں کی طرح اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ وہ دن میں سو جائیں اور رات بھر اُلّوؤں کی طرح جاگتے رہیں ۔ اس معاملے میں اُلّوؤں اور اہلِ حیدر آباد کے ڈانڈے کبھی نہیں ملتے ۔

لے دے کے مٹھی بھر مہذب لوگ یہاں آباد ہیں جو اس شہر میں وہی کچھ کرنا چاہتے ہیں جس کے کرنے کے لئے انھیں اصولاً یورپ کے کسی شہر میں پیدا ہونا چاہئے تھا ۔ اب

یہ لوگ حیدرآباد میں پیدا ہو کر پچھتا رہے ہیں اور حیدرآباد کی پہاڑ جیسی راتیں کاٹنے کے لئے ان کے پاس ایک ہی ذریعہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ راتوں میں "ورلڈ بائی نائٹ" "یونیورس بائی نائٹ" اور "رینٹ بائی نائٹ" جیسی فلمیں دیکھ ڈالیں اور اپنے دل کو تسکین پہنچائیں کہ ہم نے حیدرآباد کی رات میں پیرس کی رات دیکھ لی۔ گویا ملاوٹ کا فن اب اتنا ترقی کر گیا ہے کہ حیدرآباد کی رات میں پیرس کی رات یوں ملائی جاتی ہے جیسے مصالحہ میں گھوڑے کی لید۔

دو باتوں کی وجہ سے ہمیں حیدرآباد کی راتوں سے ڈر لگتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہاں رات کے شروع ہوتے ہی راستوں پر بلا قندیل سائیکلیں پکڑنے کا آغاز ہو جاتا ہے اور دوسری بات یہ کہ راتوں میں یہاں کی سڑکیں بڑی خطرناک ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اہلِ حیدرآباد کی اکثریت راتوں کو اس لئے باہر نہیں نکلتی کہ ان کے پاس سائیکلوں کی قندیلیں نہیں ہوتیں اور جن کے پاس قندیلیں ہوتی ہیں' ان کے پاس سائیکلیں نہیں ہوتیں اور جن بدقسمت اصحاب کے پاس سائیکلیں اور قندیلیں دونوں موجود ہوتی ہیں وہ گھروں سے اس لئے باہر نہیں نکلتے کہ رات کے وقت یہاں کی سڑکیں سائیکل رانی کے قابل نہیں رہتیں۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کے اکثر باشندے دن ڈوبنے سے پہلے ہی اپنے گھروں کو پہنچ جاتے ہیں۔ ویسے شام میں یہاں سائیکلیں پکڑنے اور پکڑوانے کا منظر بہت دل نشیں ہوتا ہے۔ پولیس کے سپاہی بلا قندیل سائیکلوں کو یوں پکڑتے ہیں جیسے ماہی گیر مچھلیوں کو پکڑتا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے ابھی حال ہی میں اپنی سائیکل کو پکڑوانے کی سلور جوبلی منائی ہے۔ ہم نے ان سے اس سلور جوبلی کے موقع پر پوچھا تھا:

"بھئی تمہیں آخر کس طرح پتہ نہیں چلتا کہ آگے پولیس کے سپاہی بلا قندیل کی سائیکلیں پکڑ رہے ہیں؟"

اس پر وہ متانت سے بولے : " بھئی! میں کیا کروں میری سائیکل کو قندیل نہیں ہوتی اس لئے مجھ کو دکھائی نہیں دیتا کہ آگے کیا ہو رہا ہے اور یوں میں پکڑا جاتا ہوں ۔ البتہ ایک مرتبہ میں نے بلا قندیل سائیکل پکڑنے والے پولیس کے سپاہیوں کو دور ہی سے دیکھ لینے کی خاطر اپنی سائیکل کو قندیل لگائی تھی، مگر میں اس دن پکڑا نہیں گیا ۔"

سائیکلیں پکڑوانا اہلِ حیدرآباد کی محبوب ہابی ہے اور سیکلیں پکڑنا یہاں کے پولیس والوں کی "محبوب ڈیوٹی" ہے ۔

صاف ظاہر ہے کہ اس کے بعد حیدرآباد کی سڑکوں پر بہت کم لوگ رہ جاتے ہیں اور یہ لوگ بھی کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہیں ۔ جن لوگوں کے گھریلو حالات اچھے ہوتے ہیں وہ فوراً گھروں کو بھاگنے کی فکر کرتے ہیں اور جن کے گھریلو حالات ٹھیک نہیں ہوتے وہ حیدرآباد کی راتوں کی رنگینی سے لطف اندوز ہونے کے لئے مارے مارے پھرتے رہتے ہیں ۔ اور انھیں رات گئے پتہ چلتا ہے کہ جب تک جیب میں پیسہ نہ ہو، رنگینی کوئی معنی نہیں رکھتی ۔ چنانچہ جب رات کے پچھلے پہر ان پر اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے تو یہ صبح کے بھولے دوسری صبح کو اپنے گھروں کو واپس ہو جاتے ہیں اور آنے والی رات میں پھر رنگینیوں کی تلاش میں گھروں سے نکل پڑتے ہیں ۔ یہ سلسلہ بس یونہی چلتا رہتا ہے ۔

حیدرآباد کے ہوٹل اور شراب خانے راتوں کو بہت آباد رہتے ہیں، لیکن یہ صرف آباد رہتے ہیں، کاروبار کچھ بھی نہیں ہوتا کیونکہ حیدرآباد کے اکثر باشندے ہوٹلوں میں اس توقع کے ساتھ جاتے ہیں کہ وہاں کوئی انھیں چائے پلائے گا ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہوٹلوں میں لوگوں کا ہجوم تو بے حد رہتا ہے مگر ہوٹل میں چائے کی پیالی آہستہ بکتی ہے ۔ بالآخر ہوٹل کا مالک مایوس ہو کر ہوٹل بند کر دیتا ہے اور اہلِ حیدرآباد بھی

چائے پیے بغیر مایوس ہوکر گھروں کو لوٹ جاتے ہیں ۔

یہاں کے شراب خانوں میں بھی ہم نے یہی حال دیکھا ہے ۔ اگر کسی شراب خانے میں کسی ٹیبل پر آدمی پی کر بھی نہ بہکے تو جان لینا چاہئے کہ یہی شخص شراب کا بل ادا کر رہا ہے ۔ اور جو اشخاص پی کر بہت جلد بہک جاتے ہیں ان کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے مفت کی پی ہے ۔ یہاں کے باشندوں کو مفت کی شراب کا نشہ بہت تیزی سے چڑھتا ہے اور جو شخص بل ادا کرتا ہے وہ تو بالکل ہی نہیں بہکتا ۔ حیدرآباد کی راتوں میں رنگینی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب میخوار سڑکوں پر نکل کر حیدرآبادی گالیاں بکنے لگتے ہیں اور رات کے سناٹے میں حیدرآبادی تہذیب کا نام روشن ہونے لگتا ہے ۔ حیدرآباد کے نوجوان اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ یہاں ایک عابد روڈ ہے ۔ اگر عابد روڈ کو یہاں سے اُٹھا کر کسی دوسرے شہر کو منتقل کر دیا جائے تو ہمیں یقین ہے کہ یہاں کے نوجوان بھی اس سڑک کے تعاقب میں دوسرے شہر کو نکل جائیں گے ۔ عابد روڈ حیدرآباد کا شاپنگ سنٹر ہے اور شاپنگ سنٹر اسے کہا جاتا ہے جہاں لڑکے، لڑکیوں کو گھوریں اور اگر گھورنے کا ذرا بھی صلہ ملے تو تعاقب کرنے لگیں، اور اگر تعاقب کا کچھ ناخوشگوار نتیجہ نہ نکلے تو "لو میریج" کر ڈالیں ۔ ہم ایک نوجوان سے واقف ہیں جو سرِ شام عابد روڈ پر یوں کھڑا رہتا ہے، جیسے وہ انسان نہیں بلکہ ایک مجسمہ ہے جسے سڑک پر نصب کر دیا گیا ہو ۔ ہم تو ایک عرصہ تک اسے مجسمہ ہی سمجھتے رہے مگر بعد میں پتہ چلا کہ یہ مجسمہ سانس بھی لیتا ہے ۔ اور وقت ضرورت سیٹیاں بھی بجاتا ہے، اور اپنی آنکھیں بھی جھپکاتا ہے ۔ یہ فی منٹ دس لڑکیوں کے حساب سے لڑکیوں کو گھورتا ہے اور دوسرے ہی منٹ میں ان سب کو بھول جاتا ہے ۔ ایسے نوجوانوں میں کالج کے طلبۂ کی اکثریت ہوتی ہے جن کے لئے ایسی سرگرمیاں" داخل درنصاب سرگرمیوں" کی تعریف میں آتی ہیں ۔

حیدرآباد کی راتوں کی شان جن اصحاب کے دم قدم سے باقی ہے۔ ان میں ادیب، صحافی اور شاعر، سینما بیں، تماش بیں پیش پیش ہیں۔ ان اصحاب کے لیے رات ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ حیدرآباد کے شاعر، دن میں کلرک بن جاتے ہیں اور رات میں شاعر بن جاتے ہیں۔ ان کا محبوب مشغلہ راتوں میں مشاعرے برپا کرنا ہوتا ہے۔ یہاں ہر گلی کوچہ میں مشاعرہ ہوتا ہے اور یہاں شعراء کی اتنی بہتات ہے کہ ہر مشاعرہ کیلئے شاعر یا سانی سپلائی ہو جاتے ہیں۔ یہاں کے شاعر رات کے وقت پتھر گٹی اور معظم جاہی مارکٹ پر پائے جاتے ہیں اور منتظمین مشاعرہ ان شعراء کو یوں ہانک کرلے جاتے ہیں جیسے گڈریا بکریوں کے گلے کو ہانکتا ہے۔ ہم نے منتظمین مشاعرہ کو" ہادہیش، ہادہیش" کی آوازیں بھی نکالتے سنا ہے۔ یہاں درجنوں کی تعداد میں شعراء ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب راتوں کے وقت سامعین کا ملنا دشوار ہوگیا ہے۔ چونکہ حیدرآباد میں راتوں کے وقت چوروں شاعروں اور صحافیوں کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اس لئے اکثر اوقات پولیس شاعروں کو چور سمجھ کر پکڑ لیتی ہے اور چور کو شاعر سمجھ کر چھوڑ دیتی ہے۔ ان دونوں کی وجہ سے یہاں پولیس کو بڑی دشواری پیش آتی ہے۔

حیدرآباد کے چور بھی دنیا کے دیگر چوروں کی طرح رات میں ہی چوری کرتے ہیں، اور دن کو شریف انسان کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

کبھی کبھار اہلِ حیدرآباد کو یہ احساس بُری طرح ستاتا ہے کہ ان کی راتیں بے کیف اور بجھی بجھی سی ہیں۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ "غزل کی رات" "قوالی کی رات" "شبِ نغمہ" اور "رقص کی رات" اور اسی قسم کی دیگر راتوں کا اہتمام کر لیتے ہیں۔ "غزل کی رات" میں ہوٹنگ ہوتی ہے۔ "قوالی کی رات" میں کانوں کے پردے پھاڑے جاتے ہیں۔ "نغمہ کی رات" میں نیند اُڑائی جاتی ہے اور "رقص کی رات" میں آپ کو اتنا تھکا دیا جاتا ہے کہ آپ کی طبیعت کئی راتوں

تک سنبھلنے نہیں پاتی۔

حیدرآباد کی راتوں کے مرکزِ جاذبہ کا تخلص "نہاری اور کلچے" ہوتا ہے۔ سچ پوچھئے تو اہلِ حیدرآباد کے لئے راتیں اسی لئے رنگین بن جاتی ہیں کہ یہاں صبح کے وقت نہاری اور کلچے کھانے کو ملتے ہیں۔ یہ لوگ ساری رات اس تسلّی میں کاٹ دیتے ہیں کہ رات کے پچھلے پہر نہاری اور کلچوں کا اہتمام ہوتا ہے۔

ہم ایک صاحب سے واقف ہیں جو ساری رات سڑکوں پر گھوم کر اس لئے گزارتے ہیں کہ صبح میں انھیں نہاری کلچے کھانے کی عادت ہے۔ ہم نے ایک دن ان سے کہا:

"قبلہ! صبح میں نہاری کلچے کھانے کے لئے ساری رات جاگنا کیا ضروری ہے؟"

اس پر وہ بولے: "بھئی اگر رات میں سو گئے اور صبح آنکھ نہ کھلی تو ساری رات ضائع ہو جاتی ہے اسی لئے رات بھر چائے پی پی کر جاگتا رہتا ہوں اور نہاری کلچے کھا کر جو سو جاتا ہوں تو دوسری شام کو بستر سے اُٹھتا ہوں۔"

حیدرآباد کی راتوں کا حال تو آپ جان چکے اب دعا کیجئے کہ اِن راتوں کی سحر ہو جائے۔ شب بخیر!

مزاحیہ رپورتاژ

ایک پلیٹ

تخلص بھوپالی

۱۳ ؍مئی ۱۹۶۶ء کو فضا میں اتنی ہی گرمی تھی جتنی کہ ۱۳ ؍مئی ۱۸۶۶ء یا ۱۳ ؍مئی ۱۷۶۶ء کو رہی ہوگی، مگر ۱۹۶۶ء کی ۱۳ ؍مئی کو ہم لوگوں کا بڑا بُرا حال تھا۔ اس دن صبح ہی سے سورج سوا نیزہ پر آگیا تھا۔ ہم پسینے میں نہائے جارہے تھے مزاح نگاروں کی کانفرنس "سنجیدہ" موڑ اختیار کر چکی تھی۔ کیونکہ ۱۳ ؍مئی کو صبح میں بمبئی کی ٹرین سے کرشن چندر، سلمیٰ صدّیقی، یوسف ناظم اور گرانڈ ٹرنک ایکسپریس سے تخلص بھوپالی آنے والے تھے۔ ہم منتظمینِ کانفرنس پچھتا رہے تھے کہ ہم نے مذاق مذاق میں کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کر کے اپنے اُوپر اچھی خاصی سنجیدگی کو طاری کر لیا ہے۔ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا، تیر کمان سے نکل چکا تھا، یعنی کرشن چندر، بمبئی سے نکل چکے تھے۔ اب تو کانفرنس کا انعقاد ضروری

ہوگیا تھا۔ اب دنیا کی کوئی طاقت سوائے ریلوے حادثے کے کانفرنس کے انعقاد کو روک نہیں سکتی تھی ۔

جب تک کانفرنس قریب نہیں آئی تھی، ہم کانفرنس سے دور دور بھاگتے تھے ۔ ہم میں اور کانفرنس میں اچھی خاصی آنکھ مچولی جاری تھی ۔ مگر اب تو مزاح نگاروں پر بڑا برا وقت آن پڑا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو بار بار یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہم لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف سازش کر کے کانفرنس منعقد کروائی ہے ۔ مگر پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کس نے کس کے خلاف سازش کی ہے۔ لیکن ایک بات پر سب متفق تھے کہ جب سازش اس نوبت کو پہنچ چکی ہو تو اسے کامیاب بنانا ہی چاہئے ۔ پھر بھی میں آخر وقت تک کانفرنس کے ٹلنے کی آس لگائے بیٹھا تھا اور اسی آس کے نتیجہ میں بار بار اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں جارہا تھا اور پوچھ رہا تھا ــــ کیوں بھئی ! آج کوئی ریلوے حادثہ نہیں ہوگا ؟

وہ کہتا ــــ اب تک تو کوئی حادثہ نہیں ہوا ۔

میں پوچھتا ــــ آخری دفعہ کب، بمبئی کی ٹرین حادثہ کا شکار ہوئی تھی ؟

وہ کہتا ــــ دو سال سے بمبئی کی ٹرین کو کوئی حادثہ نہیں ہوا ۔

اس پر میں دنگ ہو کر کہتا ــــ دِس از ٹو مچ (THIS IS TOO MUCH) بمبئی کی ٹرین کو دو سال سے کوئی حادثہ نہیں ہوا ــــ یہ بہت بڑا گیپ (GAP) ہے۔ آخر آپ لوگ کیا کرتے رہتے ہیں ؟ آج کروا دیجئے حادثہ، موقع بھی ہے بڑا مناسب ۔ کہئے تو آج کے حادثہ کے لئے پیشگی رشوت بھی دے دوں ۔

اسٹیشن ماسٹر جو میرے مذاق کی عادت سے واقف تھا، بار بار یہ سمجھ کر میری گزارش کو ٹال جاتا، جیسے میں واقعی مذاق کر رہا ہوں۔ حالانکہ اسے کیا معلوم، میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس سے یہ التجا کر رہا تھا۔

اب اسٹیشن پر منتظمینِ کانفرنس ایک جلسۂ عام کی شکل میں جمع ہو گئے تھے حفیظ قیصر نے سیاہ شیروانی پہن رکھی تھی، وہ سیاہ شیروانی پہننے میں صد فیصد حق بجانب تھا۔ کیونکہ حفیظ قیصر بھی اس کانفرنس کے انعقاد کی سازش میں میرا برابر کا شریک تھا۔ مگر حمایت اللہ کا تو حال ہی جداگانہ تھا۔ زندگی کی ہر سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹال جانا حمایت کی عادت سی ہے۔ اسی لیے لوگ حمایت سے بہت گھبراتے ہیں، بلکہ بعض اصحاب تو ایسے بھی ہیں جنھوں نے پیشگی وصیتیں لکھ رکھی ہیں کہ وہ مریں تو ان کے جنازے میں حمایت کو شریک ہونے کا موقع نہ دیا جائے کیونکہ حمایت موجود ہو تو لوگ رونا دھونا چھوڑ کر ہنسنے لگ جاتے ہیں۔ پھر نعش تو ایک طرف کونے میں پڑی رہتی ہے اور جنازے میں شرکت کرنے والے حمایت کے مزاحیہ خاکوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ سو حمایت اپنی عادت سے مجبور ایسی سنگین گھڑی میں بھی لطیفے سناتا اور بات بات پر ہنستا ہنساتا پھر رہا تھا۔

اس وقت تک کانفرنس کے صدر جناب بھارت چند کھنہّ اور نائب صدر جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، جناب اختر حسن، جناب مخدوم محی الدین، ناّمر کرنولی، مصطفٰے الکمال، صلاح الدین نیرّ، زاہد علی خاں اور ممتاز بھی اسٹیشن پر آ چکے تھے۔

ہم لوگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب بزرگ ہمارے درمیان ہوتے ہیں تو ہم احتراماً مذاق کا والیوم کم کر دیتے ہیں۔ مگر خفیہ طور پر مذاق جاری رہتا ہے ___ اور بسا اوقات یہ مذاق بزرگوں کے بارے میں ہی ہوتا ہے۔ ہم لوگوں میں سے کوئی کسی بزرگ کے بارے میں کچھ کہتا ہے، پھر مذاق کی یہ بات خفیہ طور پر کانا پھوسی کے انداز میں سب تک پہنچائی جاتی ہے۔ جب سب لوگ مذاق کی بات سُن لیتے ہیں تو سب اکٹھا ہو کر کسی محفوظ مقام پر چلے جاتے ہیں اور حسبِ استطاعت

ہنس ہنسا کر واپس آجاتے ہیں۔ بزرگ پوچھتے ہیں:

"کیوں بھئی! تم لوگ کہاں چلے گئے تھے، کس بات پر ہنس رہے ہو؟" تب ہم میں سے کوئی منہ لبسور کر کہتا ہے:

"جی کچھ نہیں، آج ذرا ٹرین لیٹ ہے، اس بات پر ہنسی آرہی تھی۔"

اور بزرگ ہماری سعادت مندی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ ہم لوگ حسب عادت خفیہ مذاق میں مصروف تھے کہ اچانک ریل کی سیٹی کی آواز آئی۔ حفیظ قیصر کا دل اچانک بیٹھ گیا کہ لو مہمان آپہنچے، حمایت سپٹپٹایا، نامر کرنولی سہم کر دو گز دور جا کھڑا ہوا اور میں نے مذاق میں کہا:

"بھائیو! بھاگو یہاں سے، ٹرین آرہی ہے اور اس ٹرین میں کرشن چندر آرہے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بھی یہاں موجود رہا تو بُرا پھنسے گا۔"

اب اسٹیشن پر کرشن چندر کو تلاش کرنے کی کوشش شروع ہو گئی تھی۔ ایک والنٹیر بھاگتے بھاگتے میرے پاس آیا اور بولا:

"بھئی، مجھے یہ بتایئے کہ کرشن چندر صاحب کا حلیہ کیسا ہے؟ تاکہ انھیں تلاش کرسکوں!"

میں نے کہا: "کرشن چندر صاحب کا حلیہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ یوسف ناظم ہیں۔"

اس نے کہا "تب تو یوسف ناظم کا حلیہ ہی بتا دیجئے۔"

میں نے کہا: "یوسف ناظم صاحب کا حلیہ سنو گے تو چیخ مار کر بے ہوش ہو جاؤ گے اسی لئے جاؤ اور اپنے بل بوتے پر کرشن چندر صاحب کو تلاش کرو۔" میرے اس تحکمانہ انداز کو بھانپ کر وہ بے چارہ بھاگ کھڑا ہوا۔

ابھی ہم پلیٹ فارم پر تھوڑی دُور بھی نہ گئے ہوں گے کہ کرشن چندر سلمیٰ آپا

کے ساتھ ڈبّے سے اُترتے نظر آئے۔ ہم لوگ تو بس اُچھل پڑے کیونکہ کانفرنس کی کامیابی کا سارا دارومدار کرشن چندر کی آمد پر تھا۔ حفیظ قیصر نے کرشن چندر کو دیکھا تو چپکے سے میرے کان میں کہہ دیا:

"بھئی لو مبارک! کانفرنس تو کامیاب ہو گئی!"

اُدھر کرشن چندر تو مخدوم، اختر حسن، عابد علی خاں اور بھارت چند کھنّہ سے بغل گیر ہونے میں مصروف تھے اور ہم لوگ ادھر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے اور بار بار گلے مل رہے تھے۔ حالانکہ کانفرنس کو کامیاب ہونے میں ابھی پورے تین دن باقی تھے۔ پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ وہ ہیں، وہ یہ ہیں۔ وہ ایسے ہیں، یہ ویسے ہیں۔ سلمیٰ آپا ڈبّے سے اُتر کر چپ چاپ ایک کونے میں کھڑی ہو گئی تھیں۔ سب لوگ کرشن چندر کو گھیرے جا رہے تھے۔ سلمیٰ آپا کو اس تنہائی سے نجات دلانے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ کرشن چندر کو فوراً پلیٹ فارم سے باہر نکالا جائے اس وقت تک منتظمینِ کانفرنس کے علاوہ ادب کے بہت سے شیدائی جمع ہو گئے تھے۔

ابھی میں کرشن چندر کو پلیٹ فارم سے باہر نکالنے کی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ یوسف ناظم دوسرے ڈبّے سے اُتر کر میرے پاس آ گئے اور آتے ہی انھوں نے اپنی "نظامت" جتانی شروع کر دی۔ کہنے لگے:

"بھئی یہ کیا لوگوں کو جمع کر رکھا ہے، چلئے یہاں سے، کرشن چندر کو نجات دلائیے اس بھیڑ سے۔"

میں بولا: "اسی مقصد کے لئے تو میں آپ کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ آجائیں تو بھیڑ آپ کو دیکھ کر خود بخود چھٹ جائے۔" میں مذاق کا یہ جملہ کہہ کر یوسف ناظم سے بغل گیر ہو گیا۔ مجھے سب کچھ یاد آنے لگا۔ گزشتہ دو مہینوں میں، میں نے یوسف ناظم کو اتنی زحمت دی تھی کہ شاید زندگی بھر انھیں اتنی زحمت نہ دے سکوں۔ بمبئی کے

مزاح نگاروں کو لانے'، کانفرنس کی تفصیلات کو طے کرنے کے لئے یوسف ناظم ہر روز پانچ چھ خط لکھا کرتے تھے اور یہ خطوط ان کے مزاحیہ مضامین سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتے تھے۔ یوسف ناظم کانفرنس کے بارے میں اتنے سنجیدہ ہو گئے تھے کہ مجھے ان کے مزاح نگار ہونے پر شبہ ہونے لگا تھا۔ کہنے کو تو میں کانفرنس کا معتمد تھا مگر یوسف ناظم نے اپنے عمل کے ذریعہ اس عہدے پر بڑی ہوشیاری سے قبضہ کر لیا تھا۔ اسی لئے یوسف ناظم سے بغل گیر ہوتے وقت میں نے اس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا کہ بعد میں جب بھی ان کی طرف دیکھا وہ اپنے سینے کی مالش کرتے ہوئے نظر آئے۔

پھر ہم سب ایک غول کی شکل میں اسٹیشن سے باہر نکلے۔ حمایت کا اصرار تھا کہ کرشن چندر کو زندہ دلانِ حیدرآباد کی شہرہ آفاق موٹر میں بٹھا کر ہوٹل تک لے جایا جائے۔ اور میں حمایت کو بار بار سمجھا رہا تھا کہ:

"بھئی، ابتدا ہی میں اگر کرشن چندر کو اس مزاحیہ موٹر میں بٹھا کر ہوٹل تک لے جایا جائے گا تو وہ شام کو بمبئی والی ٹرین سے واپس ہو جائیں گے۔ ذرا ان کو اپنے قبضہ میں آجانے دو تب بٹھائیں گے انھیں مزاحیہ موٹر میں۔ ورنہ وہ اس "سنگین مذاق" کی تاب نہ لاسکیں گے۔ پھر عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کی موٹر میں بیٹھ کر میں کرشن چندر سلمیٰ آپا اور مخدوم محی الدین ہوٹل دوارکا کی طرف نکل پڑے اور پیچھے سے زندہ دلانِ حیدرآباد کی مزاحیہ موٹر کے اسٹارٹ ہونے کی بھیانک اور خطرناک آوازیں آنے لگیں کبھی کانوں میں پٹاخے چھوٹنے لگے، کبھی بمباری کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگتا تھا، جیسے ویٹ نام ہمارا تعاقب کر رہا ہو۔

حیدرآباد کی وسیع و کشادہ اور صاف ستھری سڑکیں دیکھ کر سلمیٰ آپا تو جیسے دنگ رہ گئیں۔ وہ بار بار کہہ رہی تھیں: "کتنا خوبصورت شہر ہے، کتنا پاک و صاف شہر ہے!" اس پر میں نے عابد علی خاں صاحب کے فرزند زاہد علی خاں سے جو موٹر چلا رہے تھے۔

چپکے سے کہا : " بھئی، موٹر کو ایسے راستوں سے لے چلو جو پاک و صاف نہ ہوں۔ حیدرآباد کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر سلمیٰ آپا نے یہاں بس جانے کا فیصلہ کر لیا تو منتظمین کانفرنس کی جان پر بن آئے گی۔" مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں موٹر ہوٹل دوارکا پہنچ گئی تھی۔ ہم لوگ کرشن چندر اور سلمیٰ آپا کو ہوٹل پر چھوڑ کر یوسف ناظم کے ہمراہ ہوٹل سے نکل پڑے۔ ہمیں اب پھر اسٹیشن جانا تھا اور گرانڈ ٹرنک ایکسپریس پر تخلص بھوپالی کو ریسیو کرنا تھا۔ یوسف ناظم سناتے رہے :

" بمبئی میں کانفرنس کی بڑی دھوم ہے، بڑے چرچے ہیں، کرشن چندر اس انوکھے خیال سے بہت خوش ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

وہ نہ جانے کیا کیا کہتے رہے مگر ہم لوگ ان کی باتوں کی طرف دھیان دیئے بغیر کانفرنس کی تیاریوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ابھی تک کرسیاں نہیں آئی ہیں۔ ہال کو سجایا نہیں گیا ہے، مائیکروفون کا بندوبست نہیں ہوا ہے اور یہ نہیں ہوا ہے وہ نہیں ہوا ہے اور کل شام میں کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ہے۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ مزاح نگار ہنستے کھیلتے زندگی کی ساری تلخیوں کو جھیل جاتے ہیں۔ بس یہی ایک آسرا تھا اور ہم مطمئن تھے کہ جتنے بھی کام بچ رہے ہیں وہ بھی چٹکی بجاتے میں مکمل ہو جائیں گے۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔

ہم یوسف ناظم کو چھوڑ کر پھر اسٹیشن پہنچے۔ تخلص بھوپالی آنے والے تھے۔ تخلص بھوپالی کے بارے میں ہم بہت پریشان تھے کہ آخر انھیں کس طرح ریسیو کیا جائے۔ ہم میں سے کوئی بھی شخصی طور پر ان سے واقف نہیں تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے جاوید لطیفی کو ڈھونڈ نکالا تھا جو تخلص صاحب سے شخصی طور پر واقف تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ تخلص صاحب کی شناخت کے لئے ٹھیک وقت پر اسٹیشن پہنچ جائیں۔ مگر پلیٹ فارم پر دور دور تک ان کا پتہ نہیں تھا۔ ہم نے ہوشیاری یہ کر لی تھی کہ "سوونیر"

کی اشاعت کا بہانہ بنا کر ہر مزاح نگار کی ایک ایک تصویر منگوالی تھی ۔ اب ہم تخلص بھوپالی کی تصویر لے کر اسٹیشن پر کھڑے تھے ۔ مگر حمایت کا استدلال یہ تھا کہ تصویر ہمیشہ دھوکہ دے جاتی ہے اس پر کبھی بھروسہ نہ کرو ، لوگ ہمیشہ اپنی جوانی کی تصویریں بھیجتے ہیں ۔ کیا پتہ کہ تخلص صاحب نے بھی ایسا ہی کیا ہو ۔ ہم لوگ گاڑی آنے سے پہلے بڑی دیر تک تخلص بھوپالی کو پہچاننے کے مختلف طریقوں پر غور کرتے رہے مگر اچانک حمایت نے چٹکی بجا کر کہا :

" تم لوگ فکر نہ کرو ۔ ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے ۔ انھیں ڈھونڈھنا میرا ذمہ ۔ تم لوگ بس میرے ساتھ ساتھ چلتے رہو "

اور ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ تخلص صاحب گرانڈ ٹرنک ایکسپریس کو لے کر دندناتے ہوئے پلیٹ فارم پر آگئے ۔ ہم حمایت کا منہ دیکھنے لگے ۔ اس نے فوراً اپنا حلیہ بگاڑا ، چہرے کے اتار چڑھاؤ میں تبدیلی پیدا کی اور ہر ڈبے کے سامنے پکارنے لگا " تخلص بھوپالی ۔ ۔ ۔ ۔ تخلص بھوپالی ۔ ۔ ۔ ۔ " وہ تخلص صاحب کا نام ٹھیک اسی انداز میں پکار رہا تھا جس انداز میں اسٹیشنوں پر چائے بیچنے والے " چائے گرم ۔ ۔ ۔ ۔ چائے گرم ۔ ۔ ۔ ۔ پان بیڑی سگریٹ ۔ ۔ ۔ ۔ " کی آواز لگاتے ہیں ۔ ہم لوگ اس کی اس حرکت پر ہنس ہی رہے تھے کہ اچانک ایک ڈبے میں سے کسی مسافر کی آواز آئی :

" او میاں ! تخلص بھوپالی والے ایک پلیٹ تخلص بھوپالی ہمیں بھی دینا ـــ "

مسافر کے اس سوال پر ہم مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے ۔ حمایت کی ترکیب ناکام ہو گئی تھی ۔ مگر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ اسی اثنا میں جاوید لطیفی پلیٹ فارم پر آگئے ۔ انھوں نے آتے ہی پلیٹ فارم کے دوسرے کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ :

" وہ دیکھئے ! سگنل کے بازو جو سب سے اونچی شئے نظر آرہی ہے ، وہی تخلص بھوپالی ہیں "

اور ہم نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر ایک پہاڑ کھڑا ہوا ہے اور اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔ ہم لوگ پہاڑ کی جانب دوڑ پڑے۔ پھر جاوید لطیفی نے ہم سب کا تعارف "پہاڑ" سے کروایا۔ پہاڑ آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور ہم پہاڑ سے باتیں کر رہے تھے۔ تخلص بھوپالی نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا:

"بھئی! میں تو آپ کو ایک بزرگ آدمی سمجھتا تھا مگر آپ تو بالکل بچّے نکلے!"

اور میں نے کہا: "جی! یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔ ویسے میں بھی آپ کو ایک آدمی سمجھتا تھا، مگر آپ تو باعتبار جسامت پانچ چھ آدمی نکلے۔"

تخلص صاحب کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے۔ کہنے لگے: "بھئی! میں تو صرف آپ کے دلچسپ خطوط پڑھ کر ہی یہاں آنے پر رضامند ہو گیا، ورنہ ان دنوں میری صحت بہت خراب ہے۔ ہم تخلص بھوپالی کو دوارکا ہوٹل چھوڑ کر کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

ہم نے والینٹروں سے کہہ رکھا تھا کہ کرشن چندر کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جائے۔ افتتاحی اجلاس منعقد ہو جائے تو پھر انھیں آزادی عطا کی جاسکتی ہے۔ جب والینٹر نے بتایا کہ کرشن چندر کمرے میں موجود ہیں تو اس بات سے دل کو بڑا سکون پہنچا۔ ساتھ ہی والینٹر نے یہ بھی بتایا کہ گرمی کے مارے کرشن چندر کا بُرا حال ہے۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست سے کرشن چندر کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ انھوں نے نظام کلب میں ان کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا۔ یوں کرشن چندر اور سلمیٰ آپا ہوٹل دوارکا سے نظام کلب منتقل ہو گئے۔ پھر ٹھیک ۱۱½ بجے کرشن چندر، سلمیٰ آپا اور یوسف ناظم "سیاست" کے دفتر پہنچے۔ میرے بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر جائنٹ ایڈیٹر سیاست کو دیکھ کر کرشن چندر آگے بڑھے اور بغل گیر ہو گئے۔ وہ پورے ۱۹ برس بعد اپنے تاریخی رپورتاژ "پودے" کے ہیرو سے مل رہے تھے۔ پھر لوگ آتے گئے۔

ملاقاتیں ہوتی رہیں ۔ سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ کرشن چندر آ گئے ہیں اور جگہ جگہ کانفرنس کے چرچے ہو رہے تھے ۔

میں دن بھر اپنے ساتھیوں کو ہمہ اقسام کی ہدایتیں دیتا رہا ۔ میرے ساتھیوں کا بڑا بُرا حال تھا ۔ حفیظ قیصر کے چہرے کو دیکھ کر یہ یقین ہو چلا تھا کہ ملک کی غذائی پالیسی نہایت ناقص ہے ۔ رحیم خاں کی حالت بڑی قابلِ رحم تھی ۔ حمایت زندہ دلانِ حیدرآباد کی مزاحیہ موٹر میں اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا ، بچے کھچے کام نمٹاتے ہوئے ۔

نامر کرنولی اور مصطفےٰ کمال ، کانفرنس کے " سووینیر " کی چھپائی میں یوں مصروف تھے جیسے محاذِ جنگ پر لڑنے میں مصروف ہوں ۔ قمر اسٹیج کی سجاوٹ کی فکر میں دُبلا ہوا جا رہا تھا ۔ مگر سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت صلاح الدین نیّر کی تھی جسے ہم لوگوں نے سازشاً رابطہ کمیٹی کا کنوینر بنا دیا تھا ۔ اب رابطہ کمیٹی اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی تھی رابطہ کمیٹی نے دو دنوں سے کپڑے بدلے نہیں تھے ، کھانا نہیں کھایا تھا ۔ کبھی رابطہ کمیٹی سیکل پر نظر آتی ، کبھی موٹر میں ۔ ایک مرتبہ تو رابطہ کمیٹی کا ایک پاؤں سیکل کے پیڈل پر اور دوسرا پاؤں موٹر میں تھا ۔

دن بھر بھاگ دوڑ جاری رہی ۔ شام میں نظام کلب پر جب میں پہنچا تو کرشن چندر اسی وقت آرام کر کے اُٹھے تھے ۔ اتنے میں افسانہ نگار آمنہ ابوالحسن بھی آ گئیں ۔ کرشن چندر اور آمنہ ابوالحسن نے افسانے کے موضوع پر بحث چھیڑ دی ۔ بات چیت کے دوران جب کرشن چندر کسی بات پر میری رائے پوچھتے تو میں سوچے سمجھے بغیر کہہ دیتا :

" جی ہاں ، آپ کی رائے سے متفق ہوں ۔ "

اور جب آمنہ ابوالحسن مجھ سے کسی بات پر رائے پوچھتیں تو تب بھی میں کہتا :

" بالکل بجا فرمایا آپ نے۔"

انھوں نے بھانپ لیا کہ میں اصل میں رائے دینے کے قابل نہیں ہوں اور کانفرنس نے میرے ہوش وحواس گم کر دیئے۔ اتنے میں یوسف ناظم، اختر حسن، اور زاہد علی خاں بھی آ گئے۔ اس وقت تک سلمیٰ آپا بھی باہر چلنے کے لئے تیار ہو گئی تھیں۔ پھر ہم سب شہر کی سیر کو نکل پڑے۔

کرشن چندر پورے انیس برس بعد حیدرآباد آئے تھے۔ وہ سلمیٰ آپا کو بتاتے جا رہے تھے۔ اس مقام کا یہ نام ہے۔ یہ ہینڈی کرافٹس سنٹر ہے۔ یہ عابد روڈ ہے۔ میں کرشن چندر کی یادداشت پر دنگ رہ گیا۔ پھر لطیفے چلنے لگے، مزیدار باتیں ہونے لگیں۔ کرشن چندر مجھ سے کہنے لگے:

" بھئی! تم نے یہ اچھا کیا کہ ہم لوگوں کو یہاں لانے کی ذمہ داری یوسف ناظم پر عاید کر دی ورنہ ہم قطعاً نہ آتے۔ تم نے ایسے شخص کو یہ ذمہ داری سونپ دی تھی جو ہمارے انکار پر ہمیں پابہ زنجیر لا سکتا تھا۔" یوسف ناظم ہنسنے لگے اور مجھ سے کہنے لگے: " بھئی! ہماری ذمہ داری تو اب ختم ہو گئی، تمہاری ذمہ داری اب شروع ہونے والی ہے۔"

وہ بڑی خوشگوار شام تھی۔ یونیورسٹی، ٹینک بنڈ، باغ عام، نوبت پہاڑ اور جانے کتنے ہی مقامات کی سیر کرنے کے بعد ہم رات میں آٹھ بجے عابد روڈ پہنچے اب رات بڑھتی جا رہی تھی۔ کرشن چند کو فکر تھی کہ انھوں نے اب تک صدارتی خطبہ نہیں لکھا ہے۔

وہ رات میں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ رات میں تین بجے تک کانفرنس کے کام نمٹا کر واپس ہوا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا تھا مگر جوں ہی نیند آتی تخلص بھوپالی خواب میں آ کر سامنے کھڑے ہو جاتے اور میں چیخ مار کر بستر سے

اُٹھ بیٹھتا، پھر آنکھیں بند کرتا تو احمد جمال پاشا مزاحیہ مضمون سنانے لگتے۔ میں پھر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا۔ صبح جب میں بستر سے اُٹھا تو پتہ چلا کہ سورج پھر سوا نیزے پر پہنچ گیا ہے۔ ۱۴ ارمئی بالآخر آچکی تھی۔ جس دن کا ہم انتظار کرنا نہیں چاہتے تھے وہ خود بخود ہمارے سامنے موجود تھا۔ اس دن بذریعہ گرانڈ ٹرنک اکسپریس دلّی سے غلام احمد فرقتؔ کاکوروی، لکھنؤ سے محترمہ سرور جمال اور احمد جمال پاشا آنے والے تھے۔ پھر ہم سارے کے سارے منتظمین اسٹیشن پر جمع تھے اور وہی دشواری ہمارے سامنے تھی جو مخلصؔ بھوپالی کو رسیو کرنے کے وقت ہمیں پیش آئی تھی۔ احمد جمال پاشا اور فرقتؔ صاحب سے کوئی بھی شخصی طور پر واقف نہ تھا۔ البتہ ہم اتنا ضرور جانتے تھے کہ جس طرح یوسف ناظمؔ کرشن چندر کے حلیے میں شامل ہو گئے تھے اسی طرح احمد جمال پاشا کے حلیے میں ان کی رفیقۂ حیات سرور جمال شامل ہیں۔ والنیٹروں کو احمد جمال پاشا، سرور جمال اور غلام احمد فرقتؔ کاکوروی کی تصویریں بتا چکا تھا گاڑی آچکی تھی اور مہمانوں کی تلاش کا کام شروع ہو چکا تھا۔ سارے پلیٹ فارم پر ہمارے والنیٹرز بکھرے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک والنیٹر نے آکر اطلاع دی کہ ایک عدد احمد جمال پاشا یہاں سے تھوڑی دُور پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

میں نے پوچھا: "عینک ہے ان کے چہرے پر؟"

وہ بولا: ہاں! عینک تو ہے!"

میں نے کہا" تب تو یہی احمد جمال پاشا ہوں گے۔"

میں دوڑا دوڑا" ایک عدد احمد جمال پاشا" کے پاس پہنچا۔ اس وقت وہ اپنا سوٹ کیس اُٹھا رہے تھے۔ میں سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا" گستاخی معاف، کیا آپ احمد جمال پاشا ہیں؟

اس شخص نے کہا "آخر آپ کیا سمجھ کر مجھے احمد جمال پاشا کہہ رہے ہیں ؟"

میں نے کہا : "میں آپ کو احمد جمال پاشا سمجھ کر احمد جمال پاشا کہہ رہا ہوں۔"

وہ بولا : دیکھئے میں آپ کو نہیں جانتا ، نہ دوستی نہ ملاقات !"

مجھے اس شخص کی بات پر یقین نہ آیا ۔ میں نے سمجھا یہ شخص ضرور احمد جمال پاشا ہے ۔ اور چونکہ احمد جمال پاشا مزاح نگار ہیں اسی لئے ہوسکتا ہے کہ مذاق کر رہے ہوں ۔ اب کی بار میں نے مزید بے تکلف ہوکر کہا :

"اچھا بھئی ۔ آپ احمد جمال پاشا نہ سہی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ جو عینک آپ نے چہرے پر لگا رکھی ہے وہ ضرور احمد جمال پاشا کی ہے ۔"

"آپ بھی کیا مذاق کرتے ہیں !" اس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

اس کی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے صد فیصد یقین ہوگیا کہ یہ احمد جمال پاشا ہی ہیں ۔ میں نے جھٹ سے کہا :

"اچھا مذاق بند کرو ، پہلے یہ بتاؤ تمہاری بیگم صاحبہ کہاں ہیں ؟"

تب تو اس شخص کے تن بدن میں آگ لگ گئی ، اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ۔ ابھی وہ میرے مذاق کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک والنٹیر بھاگا بھاگا آیا اور بولا "صاحب ، جلدی کیجئے ، پلیٹ فارم کے دوسرے کنارے پر ایک اور احمد جمال پاشا دریافت ہوئے ہیں ۔ ان کے ساتھ ایک محترمہ بھی ہیں ، چل کر دیکھ لیجئے ۔"

میں اس شخص کو غصے کی حالت میں چھوڑ کر پلیٹ فارم کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا ۔ وہاں واقعی احمد جمال پاشا اپنی رفیقۂ حیات سرور جمال کے ساتھ ٹھیرے ہوئے تھے مگر تھوڑی دیر پہلے کے سانحہ کا اثر مجھ پر اتنا زیادہ تھا کہ ثبوت و شہادت کے باوجود میں نے احمد جمال پاشا سے یہ نہیں پوچھا کہ آیا وہ واقعی احمد جمال پاشا ہیں !

بس میں نے اتنا پوچھا :

"کیا آپ کانفرنس میں شرکت کرنا چاہتے ہیں؟"

وہ بولے "ہاں!"

میں نے کہا "تب تو چلئے ہمیں تو ایک عدد احمد جمال پاشا کی ضرورت تھی۔ وہ آپ ہوں یا نہ ہوں ہمیں اس سے کیا غرض!"

ہمیں آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ کانفرنس میں جن احمد جمال پاشا نے شرکت کی تھی وہ واقعی احمد جمال پاشا تھے یا کوئی اور۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اسی اثناء میں ہمارے والنٹیروں نے غلام احمد فرقت کاکوروی کو بھی تلاش کرلیا تھا۔ ہم سب اسٹیشن سے باہر نکل پڑے اور دوارکا ہوٹل پہنچ گئے۔

اب کانفرنس کا کورم پورا ہوچکا تھا۔ شفیقہ فرحت بھی بھوپال سے حیدرآباد پہنچ چکی تھیں۔ سلیمان خطیب گلبرگہ سے آچکے تھے اور دلاور فگارؔ، مائل لکھنوی اور علامہ بے نام دوسرے دن کی ٹرین سے حیدرآباد پہنچنے والے تھے۔ مجھے آخر وقت تک فکرؔ تونسوی کی فکر تھی۔ وہ کانفرنس سے عین پہلے "ٹائیفائیڈ" میں مبتلا ہوگئے تھے اور ہزار کوشش کے باوجود ٹائیفائیڈ نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب میں دوارکا ہوٹل پہنچا تو حفیظ قیصر نے فکرؔ تونسوی کا ایک خط دیا جو اسی صبح کی ڈاک سے آیا تھا۔ فکر صاحب نے بڑی دردانگیز اسپرٹ کے ساتھ ایک ہی جملہ لکھا تھا:

" ٹائیفائیڈ کے لرزتے ہاتھوں سے فکرؔ تونسوی مزاح نگاروں کی پہلی کانفرنس کو سلام بھیجتا ہے۔"

اور میں تھوڑی دیر کے لئے سنجیدہ ہوگیا۔ فکرؔ تونسوی کے اس جملے میں حسرت و یاس کا ایک طوفان پوشیدہ تھا۔ شام میں کانفرنس کا افتتاح ہونے والا تھا۔ میں مہمانوں کو صلاح الدین نیرؔ عرف رابطہ کمیٹی کی تحویل میں دے کر فوراً اردو ہال پہنچ گیا۔ وہاں سینکڑوں کام پڑے تھے۔ منتظمین بے حد مصروف تھے، کرسیاں جمائی جارہی تھیں

برقی کے کنکشن دیئے جا رہے تھے۔ مائیکروفون نصب کیا جا رہا تھا۔ قمر نے اسٹیج کو سجانے کی کوشش میں اپنا حلیہ بگاڑ رکھا تھا۔

میرے بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر کو حیدرآباد اور اہلِ حیدرآباد کی عزت و ناموس کا بڑا خیال رہتا ہے۔ وہ کسی بھی معاملہ میں ذرا سی بدنظمی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہر کام کو وقت سے پہلے کرنا ان کی عادت ہے۔ وہ ہماری تیاریوں سے مطمئن نہ تھے۔ ان کا خیال تھا:

"یہ مسخرے اہلِ حیدرآباد کی ناک کٹوا دیں گے، ابھی تک ہال کو نہیں سجایا گیا، کرسیاں تک نہیں جمی ہیں ــــ مہمان آئیں گے تو کہاں بیٹھیں گے؟"

حمایت انھیں سمجھاتا کہ "صاحب! ــــ مہمان تو شام میں آئیں گے اور اس وقت تک کرسیاں رکھ دی جائیں گی۔ آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟"

مگر وہ کسی طرح مطمئن نہ ہوتے۔ وقفہ وقفہ سے اُردو ہال آتے اور کام کی رفتار کا جائزہ لے کر اور حسبِ استطاعت مجھ پر برس کر واپس ہو جاتے۔ ان کی لگاتار ڈانٹ ڈپٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام تک ہال جلسے کے لئے بالکل تیار ہو گیا۔ صبح میں جہاں ویرانی تھی وہاں اب ہر طرف تازگی ہی تازگی نظر آنے لگی۔ ابھی ہم کرسیاں اِدھر سے اُدھر منتقل کر ہی رہے تھے کہ کرشن چندر، سلمیٰ آپا اور یوسف ناظم اُردو ہال پہنچ گئے۔

کرشن چندر نے آتے ہی یہ خوشخبری سُنائی:

"مجتبیٰ! میں نے صدارتی خطبہ لکھ دیا ہے۔" پھر وہ بولے: "بھئی، اس گرمی کا کچھ بندوبست کرو، نہیں تو میں مر جاؤں گا۔"

اور ہم اُردو ادب کا اتنا بڑا نقصان کرنے کے لئے ہرگز ہرگز تیار نہ تھے۔ چنانچہ کرشن چندر کو نظام کلب سے رٹز ہوٹل منتقل کر دیا گیا۔ کانفرنس کو شروع ہونے

یں پورے دو گھنٹے باقی تھے ۔ ہال کانفرنس کے لئے بالکلیہ تیار ہوچکا تھا۔ اتنے میں کانفرنس کے صدر استقبالیہ بھارت چند کھنہ آ گئے۔ کھنہ صاحب آئی اے ایس عہدیدار ہیں اور خیر سے ریاست کے لیبر کمشنر ہیں۔ لیکن خدا نے انھیں اتنی اچھی فطرت سے نوازا ہے کہ ان کے آئی اے ایس ہونے پر کوئی یقین نہیں کرتا۔ پھر مزاح نگاری نے تو ان کی عہدیداری کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ وہ مزاح نگار پہلے ہیں اور عہدیدار بعد میں۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ عہدیدار بھی اتنے ہی اچھے ہیں جتنے اچھے مزاح نگار۔ بھارت نے صرف چند ہی کھنہ ایسے پیدا کئے ہیں جیسے کہ ہمارے یہ بھارت چند کھنہ ہیں۔ ہم نے اور بھی کھناؤں کو دیکھا ہے مگر ان کھناؤں میں وہ بات نظر نہ آئی جو بھارت چند کھنہ میں ہے۔ اور یہ سب کچھ مزاح نگاری کی دین ہے۔ انھیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر حکومت کے سارے ہی عہدیدار مزاح نگار بن جائیں تو نظم و نسق کی کارکردگی کتنی بہتر نہ ہو جائے۔ کھنہ صاحب نے آتے ہی ہم لوگوں کے کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ میں نے کہا:

"صاحب! آپ کیوں زحمت کرتے ہیں، آپ اطمینان سے بیٹھئے، جو بھی کام بچ رہے ہیں وہ مہمانوں کے آنے سے پہلے مکمل ہو جائیں گے۔"

مگر کھنہ صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ وہ برابر ادھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ کاموں کی نگرانی کر رہے تھے۔ جب وہ انتظامات سے پوری طرح مطمئن ہوگئے تو اردو ہال کی سیڑھیوں پر جا کھڑے ہوئے تاکہ مہمانوں کا استقبال کیا جا سکے۔

مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ ہال کے باہر بھی لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ کرشن چندر ہال میں داخل ہوئے تو حاضرین کے جوش و خروش کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ گرمی نے حاضرین کو

بہت تنگ کر رکھا تھا اور اس مقصد کے لئے ہم نے کانفرنس کے "سوونیر" کی فروخت کا بندوبست کر دیا تھا۔ لوگ سوونیر کی ایک کاپی خریدتے اور اسے پنکھے کے طور پر استعمال کرتے۔ اس دن کانفرنس کا سوونیر اس کثرت سے فروخت ہوا کہ سوونیر کمیٹی کے کنوینر ناصر کرنولی پریشان ہو گئے۔ وہ تھوڑی دیر بعد پریس بھاگتے جہاں سوونیر کی جلد سازی ہو رہی تھی۔ مجھے ناصر کرنولی اور مصطفٰے کمال کی حالت پر بڑا رحم آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے صبح سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اور سوونیر کی طباعت کو مکمل کرنے کے لئے ہمہ تن مصروف تھے۔

ٹھیک سات بجے میں اسٹیج پر پہنچا

۔ پھر کانفرنس کے صدر بھارت چند کھنہ بھی اسٹیج پر آگئے۔ اس دن تو لوگ جیسے ہنسنے پر تلے بیٹھے تھے۔ میرے اسٹیج پر پہنچتے ہی لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا اور میں نے حاضرین سے کہا:

"حاضرین! ہنسنے کے معاملہ میں محتاط ہو جائیے۔ اپنی ہنسی ذرا دیکھ بھال کر خرچ کیجئے۔ اگر ایک مزاح نگار آپ کے پیٹ میں سو بل ڈال دے تو ۲۸ مزاح نگار یقیناً ۲۸۰۰ بل ڈال سکتے ہیں۔ اگر آپ ہنسنے کے معاملے میں کفایت شعاری کا ثبوت نہ دیں اور آپ کو کچھ ہو جائے تو اس کی ذمہ داری منتظمینِ کانفرنس پر قطعاً عاید نہ ہوگی۔" لوگ میری اس بات پر بھی ہنسنے لگے۔ میں نے کہا: "آپ ہنستے ہیں ضرور ہنسئے۔ میرا کام آپ کو صرف خطرے سے آگاہ کرنا تھا۔ اب آپ جانیں اور آپ کی ہنسی۔"

پھر میں نے حاضرین کو یہ خوشخبری سنائی کہ اب سارے مزاح نگاروں کو باری باری اسٹیج پر آنے کی زحمت دی جائے گی تاکہ جو اصحاب اب تک صرف مزاح نگاروں کی تحریریں پڑھ کر ہنستے آئے ہیں وہ لگے ہاتھوں انھیں دیکھ کر بھی مسکرائیں۔ سب سے پہلے میں نے اعلان کیا:

" خواتین وحضرات! یہ بات ہمارے لئے فخر کا باعث ہے کہ مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس کی صدارت ایشیا کے عظیم افسانہ نگار اور طنز نگار جناب کرشن چندر کر رہے ہیں۔ کرشن چندر کی طنز نگاری سے کون واقف نہیں ہے، وہ نہ صرف دوسروں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ اپنی ذات کو بھی طنز سے بالاتر نہیں سمجھتے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے " ایک گدھے کی سرگزشت " لکھی اور اسے اپنے نام سے شائع کروایا، اب میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ ڈائس پر تشریف لائیں اور قہقہوں کا بزنس کرنے والوں کی اس کانفرنس کی صدارت قبول فرمائیں ۔"

ہال میں اچانک اتنی زوردار تالیاں بجیں کہ میں چونک گیا۔ تالیوں کی گونج میں کرشن چندر اسٹیج پر آئے اور کھنہ صاحب نے ان کی گلپوشی کی۔ حاضرین پر پھر ایک بار تالیوں کا دورہ پڑا۔ بڑی دیر بعد جب ہال میں تین چار تالیاں ہی باقی رہ گئیں تو میں نے مخدوم محی الدین کا نام پکارا۔ مخدوم، مزاح نگار تو نہیں ہیں لیکن خانگی محفلوں کی بات چیت میں بڑے سے بڑا مزاح نگار بھی حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور شگفتگی میں مخدوم کے آگے دَم نہیں مار سکتا اور ہم نے اسی مناسبت سے مخدوم کو کانفرنس کا افتتاح کرنے کی زحمت دی تھی۔ مخدوم ڈائس پر آئے تو حاضرین پر پھر تالیوں کا دورہ پڑا۔ اب مزاح نگاروں کی باری تھی ۔

پہلے غلام احمد فرقت کاکوروی آئے ۔ اس کے بعد زینت ساجدہ، سلمیٰ صدیقی، شفیقہ فرحت، احمد جمال پاشا، یوسف ناظم، رشید قریشی، سرور جمال، مخلص بھوپالی، مرزا شکور بیگ، سلیمان خطیب، علی صائب میاں اور مسافر نلگنڈوی یکے بعد دیگرے اسٹیج پر آ گئے۔ کھنہ صاحب گلپوشی کر رہے تھے۔ اور میں ہر ایک کا تعارف کروا رہا تھا۔

اب کانفرنس، افتتاح کے لئے بک کر تیار ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے جناب بھارت چند کھنہ نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھا جسے سُن کر سامعین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ

ہوگئے۔ میں نے مخدوم سے اِستدعا کی کہ وہ کانفرنس کا افتتاح فرمائیں۔ مخدوم صاحب کو ہم نے سینکڑوں مرتبہ تقریریں کرتے سُنا ہے۔ وہ تقریروں میں کہیں نہ کہیں مذاق کی بات ضرور کہہ جاتے ہیں۔ مگر مزاح نگاروں کی کانفرنس میں انھوں نے خلاف توقع نہایت سنجیدہ تقریر کر ڈالی۔ انھوں نے کہا:

"مزاح نگاروں کو ادب میں ان کا جائز مقام ملنا ہی چاہیے۔ مزاح نگاروں کے قوم پر بڑے احسانات ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

مزاح نگاروں کے حقوق اور ان کے مقام کے بارے میں وہ حد سے زیادہ سیریس ہوگئے تھے اور جب انھوں نے اپنی دھواں دھار تقریر ختم کی تو ہال میں بڑی دیر تک تالیاں گونجتی رہیں۔ تب میں نے جناب کرشن چندر سے گزارش کی کہ وہ اپنا صدارتی خطبہ پڑھیں۔ کرشن چندر نے اِدھر خطبۂ صدارت شروع کیا اور اُدھر سامعین پر ہنسی کے دورے پڑنے لگے۔ کرشن چندر کا خطبہ تالیوں اور قہقہوں کے نرغے میں آچکا تھا۔ لوگ تالیاں بجاتے بجاتے عاجز آچکے تھے اور کرشن چندر انھیں بار بار تالیاں بجانے پر مجبور کر رہے تھے۔ کرشن چندر کا خطبہ ختم ہونے تک حاضرین کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوگیا تھا۔ پھر اس کے فوراً بعد کانفرنس کے پہلے ادبی اجلاس کا آغاز ہوگیا۔

سب سے پہلے سلمیٰ صدیقی نے اپنا دلچسپ مزاحیہ مضمون سُنایا۔ پھر بھارت چند کھنہ احمد جمال پاشا اور غلام احمد فرقت کاکوروی نے سامعین کو باری باری سے اتنا ہنسایا کہ وہ اَدھ موئے سے ہوگئے۔

اب پہلے ادبی اجلاس کو زیادہ دیر تک جاری رکھنا قرینِ مصلحت نہیں تھا۔ کیونکہ ہمیں اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ ہنستے ہنستے بے ہوش نہ ہوجائیں اور ہم سامعین کے ساتھ ایسا خطرناک مذاق کرنے کے موڈ میں قطعاً نہیں تھے۔ قہقہوں کا وہ عالم تھا

کہ اُردو ہال کی دوسری منزل کی چھت اُڑ گئی، اور مجبوراً ہم کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ کانفرنس کا دوسرا ادبی اجلاس، اگلے روز نچلی منزل میں منعقد ہوگا۔ اجلاس کے فوراً بعد سارے ہی مزاح نگار جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کے گھر ڈنر پر مدعو تھے عابد علی خاں صاحب کے گھر پر ادیبوں اور شاعروں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ بڑی پُرتکلف ضیافت تھی۔ میں عابد علی خاں صاحب کا اتنا احترام کرتا ہوں کہ ان کے سامنے سیدھی طرح بات بھی نہیں کرسکتا۔ اور اس احترام کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اور لوگ تو ڈنر کھاتے وقت اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکتے رہے اور میں احتراماً گردن جھکائے مسلسل کھانے میں مصروف رہا۔ اور اس دن مجھے پتہ چلا کہ بزرگوں کا احترام کرنا کتنا فائدہ بخش ہوتا ہے۔ اس کے بعد فائن آرٹس اکیڈیمی کے فن کاروں نے اپنا رنگ جمایا۔ بے شمار مزاحیہ خاکے پیش کئے۔ جب حمایت اور مصطفےٰ علی بیگ نے مخدوم صاحب کی مشہور نظم "اک چنبیلی کے منڈوے تلے" کی پیروڈی، قوالی کے انداز میں پیش کی تو کرشن چندر پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگے۔ رات دیر گئے تک عابد علی خاں صاحب کے گھر پر قہقہوں کا طوفان برپا رہا۔

پھر ۱۵ رمئی کا سورج طلوع ہوا۔ اس دن ہر طرف کانفرنس ہی کانفرنس تھی۔ پورے چار اجلاس سر پر کھڑے ہوئے تھے، اس دن بمبئی سے علاّمہ بے نام، مائل لکھنوی دلاور فگار، کانفرنس کے کل ہند مزاحیہ مشاعرے میں شرکت کے لئے پہنچے۔ ٹھیک دس بجے اُردو ہال میں کانفرنس کے دوسرے ادبی اجلاس کا آغاز غلام احمد فرقت کاکوروی کی صدارت میں ہوا۔ اُردو ہال میں حاضرین کی اتنی کثرت تھی کہ ایک صاحب ہتھیلی پر تِل کا ایک دانہ رکھے منتظمین سے یہ پوچھ رہے تھے کہ یہ تِل کہاں رکھی جائے۔

اس دن کے اجلاس کی "اوپننگ مزاح نگار" سرور جمال تھیں۔ پھر میری باری آئی، پھر رشید قریشی بیاٹنگ کرنے لگے۔ پھر تخلص بھوپالی بڑی تیزی سے

قہقہوں کا اسکور بڑھانے لگے۔ پھر شفیقہ فرحت نے چوٹے، یوسف ناظم نے چھکے لگائے، آخر میں کرشن چندر نے طنز و مزاح کی اسٹائلش بیاٹنگ کا مظاہرہ کیا اور سنچری بنانے کے باوجود ناٹ آوٹ رہے ۔ یہ اجلاس بڑا کامیاب رہا۔ جوں ہی اجلاس ختم ہوا لوگ آٹوگراف بکس لے کر مزاح نگاروں پر ٹوٹ پڑے۔ کرشن چندر کے اطراف لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اگر وہ سنجیدگی سے آٹوگراف بکس پر دستخط کرنے بیٹھ جاتے تو یہ زندگی بھر دستخط ہی کرتے رہ جاتے ۔ کانفرنس کے صدر استقبالیہ جناب بھارت چند کھنہ نے مزاح نگاروں کے اعزاز میں "منجو کیفے" میں لنچ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ہمیں وہاں فوراً پہنچنا تھا۔ کیونکہ سہ پہر میں مزاح نگاروں کا "بزنس سیشن" تھا۔ مگر لوگ کرشن چندر کو رہا کرنے پر راضی نہ تھے۔

میں بار بار لوگوں کو چیرتا، لڑتا، بھڑتا ان تک پہنچتا اور کہتا :

"کرشن صاحب جلدی کیجئے لنچ کا وقت ہو رہا ہے ۔"

مگر نہ تو وہ میری بات سنتے تھے اور نہ ہی ان کے شیدائی مجھے کوئی بات کہنے دیتے تھے ۔

اب کی بار مجھے ایک ترکیب سوجھی ۔ میں پھر لوگوں کو چیرتا ہوا اُن تک پہنچا اور چیخ کر بولا :

"کرشن صاحب، جلدی کیجئے ڈنر کا وقت ہو رہا ہے ۔"

لنچ کی بجائے "ڈنر" کا نام سن کر کرشن چندر فوراً چونک گئے اور اپنا قلم بند کر کے ہجوم میں سے فوراً باہر نکل آئے ۔

کھنہ صاحب کی طرف سے دیا ہوا لنچ اتنا ہی مزیدار تھا جتنا کہ ان کے مضامین ہوتے ہیں ۔ انھوں نے از راہِ مہمان نوازی خود کچھ نہ کھایا، بس مہمانوں کو کھلانے میں ہی مصروف رہے ۔ میں ان سے بار بار کہتا رہا : "آپ بھی کچھ کھائیے ــــ"

مگر انھوں نے کھانے کو چکھا تک نہیں ۔ بعد میں غور کیا تو یہ نکتہ مجھ پر واضح ہوا کہ کھنہ صاحب نے اس لنچ پر کثیر رقم صرف کی تھی اور ظاہر ہے کہ انھیں کھانے میں کیا خاک لطف آسکتا تھا ۔ پھر میں نے مہمانوں پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ تخلص بھوپالی بھی چپ چاپ بیٹھے ہیں ۔ سب لنچ کھا رہے ہیں اور وہ خاموش بیٹھیں، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ۔

حفیظ قیصر نے مجھ سے کہا :

" بھئی لنچ تو کھنہ صاحب دے رہے ہوں، پھر تخلص صاحب نے کس غم میں اپنے آپ کو کھانے سے دست بردار کرلیا ہے ؟"

میں تخلص بھوپالی کے پاس گیا تو پتہ چلا کہ ان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے، اور وہ محض " آدابِ محفل " کی خاطر اُٹھ کر جانا نہیں چاہتے ۔ مجھے تخلص صاحب کی یہ وضعداری اس وقت اچھی نہیں لگی ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ طبیعت بگڑ رہی ہو اور آدمی محض " آدابِ محفل " کی خاطر " آدابِ صحت " کو قربان کر ڈالے ۔ میں زبردستی انھیں اُٹھا کر لے گیا اور ان کی قیامگاہ پر پہنچا دیا ۔ لنچ ختم ہوا اور مندوبین " بزنس سیشن " میں شرکت کے لئے چل پڑے ۔

اس سیشن کے صدر یوسف ناظم اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کنوینر تھے ۔ کئی تجویزیں اس اجلاس میں پیش ہوئیں ۔ کسی نے کہا مزاح نگاروں کی ایک الگ انجمن بنائی جائے اور بہتوں نے اس کی مخالفت کی ۔ بالآخر مسلسل بحث و تکرار کے بعد مزاح نگاروں کے اس مشترکہ بیان کا مسودہ تیار کرلیا گیا جو اس کانفرنس کا " حاصل " رہا ۔

ابھی ہم بزنس سیشن کے حملے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ " سمپوزیم " نے ہم لوگوں کو آن دبوچا ۔ اس وقت تک میں تھک کر چور ہو چکا تھا ۔ جب ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی صدارت میں سمپوزیم کا آغاز ہوا تو میں تقریباً اونگھنے لگا تھا ۔ اُردو ہال مہمانوں سے بھر گیا

تھا۔ ڈاکٹر انور معظم نے "موجودہ دَور اور طنز و مزاح" کے زیرِ عنوان مقالہ سُنایا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، محترمہ زینت ساجدہ، مغنی تبسم اور اختر حسن نے مقالہ پر بحث میں حصّہ لیا۔ اس کے بعد احمد جمال پاشا بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے مائیک پر پہنچے۔ مزاح نگار زندگی میں کبھی کبھار ہی سنجیدہ بن جاتا ہے مگر احمد جمال پاشا تو اس دن حد سے زیادہ سنجیدہ بن گئے۔ اور مزاح نگار کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ جب وہ سنجیدہ بن جاتا ہے تو اور بھی غیر سنجیدہ نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ احمد جمال پاشا نے جب اپنی تقریر ختم کی تو سمپوزیم کے کنوینر مسٹر تامر کرنولی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ :

" احمد جمال پاشا کی سنجیدہ تقریر ان کے مزاحیہ مضامین سے بھی زیادہ دلچسپ تھی۔"

پھر کرشن چندر نے بحث میں حصہ لیا اور اپنی مختصر سی تقریر میں موجودہ دَور اور مزاح نگاروں کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی۔ شام ہو چلی تھی اور سمپوزیم جاری تھا۔ اور اگر تامر کرنولی نے مباحث پر تحدید عاید نہ کی ہوتی تو کیا عجب کہ یہ تادم تحریر جاری رہتا۔ ½۷ بجے ہم سب پھر نظام کلب کی طرف چل پڑے۔

رات میں ٹھیک نو بجے کل ہند مزاحیہ مشاعرہ ہونے والا تھا۔ دن بھر کی طوفانی مصروفیت کے بعد مزاح نگار تھک چکے تھے۔ میں تو بڑی مشکل سے چل پھر رہا تھا۔ کرشن چندر کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ سلمیٰ آپا کے چہرے کو دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مزاح نگار ہیں۔ البتہ یوسف ناظم بدستور مزاح نگار بنے ہوئے تھے۔ مشاعرے کے سارے انتظامات حمایت اللہ نے سنبھال لئے تھے۔ اسی لئے ہم لوگ کافی دیر تک نظام کلب میں بیٹھنے کے بعد ٹھیک گیارہ بجے مزاحیہ مشاعرے میں پہنچے۔ نمائش میدان میں ہر طرف انسانوں کے سر ہی سر تھے۔ جناب دلاور فگار مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ کرشن چندر جب ڈائس پر پہنچے تو انھوں نے ایک نظر مجمع پر ڈالی اور پھر حیرت سے پوچھنے لگے :

"کیا حیدرآباد میں اتنے لوگ رہتے ہیں؟"

اور میں نے کہا: "اس سے بھی زیادہ لوگ رہتے ہیں مگر بہتوں کو مشاعرے کا ٹکٹ نہیں مل سکا ہے، اسی لئے وہ گھروں میں سو رہے ہیں۔"

حیدرآباد میں آج تک اتنا بڑا اجتماع دیکھنے میں نہ آیا۔ کرشن چندر اور سبھی آیا اہلِ حیدرآباد کے اس جوش و خروش سے بے حد متاثر تھے۔ مشاعرہ جاری تھا۔ دلاور فگار دونوں ہاتھوں سے مشاعرہ لوٹ رہے تھے اور پولیس کے سپاہی چپ چاپ کھڑے ان کی لوٹ مار کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ مشاعرہ ابھی جاری ہی تھا کہ میں موٹر میں اونگھتے اونگھتے گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے سارے گھوڑے بیچ دیئے اور سو گیا۔

دوسرے دن صبح اٹھا تو پتہ چلا کہ کانفرنس ختم ہوگئی۔ وہ کانفرنس جس نے پورے ایک مہینے تک ہماری نیندیں حرام کر رکھی تھیں، بالآخر داعیِ اجل کو لبیک کہہ چکی تھی۔ میں مطمئن تھا۔ ہم نے کانفرنس کے روپ میں مزاح نگاروں کے ساتھ جو "پریکٹیکل جوک" کیا تھا وہ نہایت کامیاب رہا تھا۔ اب مہمانوں کو کانفرنس سے نجات مل چکی تھی۔ البتہ چھوٹے موٹے ادبی جلسوں نے انھیں گھیرے میں لے لیا تھا۔

دوسرے دن میں ہوٹل ودار کا گیا تو احمد جمال پاشا نے نہایت پُرجوش انداز میں مجھے کانفرنس کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ فرقت صاحب نے گلے سے لگا لیا اور کہا:

"تم نے کل بہت عمدہ مضمون پڑھا، بس جی خوش ہوگیا۔ اب ہم سینئر مزاح نگار مطمئن ہیں کہ چلو ہمارے بعد ہماری روایت کو آگے لے کر بڑھنے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ کم از کم اب تو میں سکون سے مر سکتا ہوں۔"

اور میں نے جھٹ سے کہا: "فرقت صاحب! آپ نے غلط سمجھا، میرے مضمون لکھنے کا مقصد قطعاً یہ نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔"

فرقت صاحب، جب باتیں کرتے ہیں تو بے حد دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ گھنٹوں

باتیں کرتے ہیں اور لوگوں کو مسلسل ہنساتے رہتے ہیں۔ اس دن انھوں نے بے شمار لطیفے سُنائے۔ بنارس کے کسی مشاعرے میں ان پر جو ہوٹنگ ہوئی تھی اس کا حال انھوں نے اس قدر دلچسپ انداز میں سُنایا کہ میرا تو ہنستے ہنستے بُرا حال ہوگیا۔ فرقت صاحب بار بار شکر پھانکتے اور لطیفے سُناتے جاتے اور ان کی مسلسل شکر خوری کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ملک میں شکر کی قیمت میں اضافہ کا اصل سبب فرقت صاحب ہیں۔ تخلص بھوپالی، فرقت صاحب کی باتوں پر اتنا قوی ہیکل قہقہہ لگاتے کہ ہم لوگ تھوڑی دیر کے لئے سہم جاتے تھے۔ تخلص بھوپالی پٹھان ہیں اور ان کا قہقہہ تو حد سے زیادہ پٹھان ہوتا ہے۔

اب مزاح نگاروں کی واپسی کا وقت قریب آرہا تھا۔ سب سے پہلے فرقت صاحب اور تخلص بھوپالی ہم لوگوں سے بور ہو کر چلے گئے۔ احمد جمال پاشا اور محترمہ سرور جمال شہر کی تفریح میں مصروف رہے اور اسی لئے وہ بور نہ ہو سکے۔ کرشن چندر اور سلمیٰ آپا کو دعوتوں نے تنگ کر رکھا تھا۔ ۱۶ رمئی کو شام میں کرشن چندر بہت مصروف تھے۔ انھیں اور سلمیٰ آپا کو شام میں خواتین کی ایک لائبریری کا معائنہ کرنا تھا اور اس دن انجمن ترقی اُردو کی جانب سے ادیبوں کے اعزاز میں ایک عصرانہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔

میں، کرشن چندر اور سلمیٰ آپا مل کر "خواتین کی لائبریری" دیکھنے گئے۔۔۔ وہاں خواتین کم تھیں اور لائبریری زیادہ تھی۔ پھر لائبریری کے منتظمین لائبریری دکھانے سے کہیں زیادہ کرشن چندر اور سلمیٰ آپا کی خاطر تواضع کرنا چاہتے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لائبریری دکھانے کا تو صرف بہانہ تھا۔ لائبریری کے منتظمین میں حیدرآباد کی ایک ممتاز خاتون سماجی کارکن بھی موجود تھیں جو اُردو میں بات چیت کرتے وقت انگریزی الفاظ کا بڑی کثرت سے استعمال کرتی ہیں، اور جب انگریزی میں بات کرتی ہیں تو بلا تکلف

اُردو الفاظ کو استعمال میں لاتی ہیں۔ سلمیٰ آپا ان کی باتیں بہت غور سے سُن رہی تھیں اور میں سلمیٰ آپا کی حیرت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھر بات چیت کے دَوران بالآخر ایک لطیفے کی گنجائش نکل ہی آئی۔ ان خاتون نے کہا :

" صاحب، اتنا ہارڈ ورک، دی پیپل ڈو کہ سم ٹائمز میں تو ونڈر کرنے لگ جاتی ہوں صاحب! کیا بتاؤں "الف" سے لے کر "زیڈ" تک سارے کام ہم ہی کرتے ہیں۔"

لائبریری کا معائنہ ختم ہوا، اور جب ہم اُردو ہال جانے لگے تو میں نے کرشن چندر کو "الف" سے "زیڈ" والی بات یاد دلائی، تب تو موٹر میں ہنسی کا وہ طوفان برپا ہوا کہ بیچارہ ڈرائیور پریشان ہو گیا۔

۱۷ مئی کو "حلقۂ اربابِ ذوق" کے کارکنوں نے کرشن چندر کے ساتھ ایک شام گنوانے کا بندوبست کیا تھا۔ اس دن حمایت نے کہا :

" کرشن چندر کل یہاں سے جانے والے ہیں اسی لئے انھیں کم از کم اب تو زندہ دلانِ حیدرآباد کی مزاحیہ موٹر میں بٹھایا جانا چاہیے۔"

سو ہم زندہ دلانِ حیدرآباد کی موٹر کو لے کر رِٹز ہوٹل پہنچے۔ اس موٹر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کوئی چھت نہیں ہے۔ نشستوں کی جگہ اینٹوں اور گارے کی مدد سے چبوترے بنا دیئے گئے ہیں جن پر شطرنجیاں اور چادریں بچھائی جاتی ہیں۔ یہ جب اسٹارٹ ہوتی ہے تو رُکنے کا نام نہیں لیتی اور جب رکتی ہے تو اسٹارٹ ہونے سے قطعاً انکار کر دیتی ہے۔ کبھی دُلکی چال چلتی ہے تو کبھی چوکڑیاں بھرنے لگتی ہے۔ اسے کھانسی کے دورے بڑی شدت سے پڑتے ہیں۔ پھر اچانک یہ کھانسی کم ہو جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے انجن کی روح پرواز کر گئی ہو۔ جب بھی اس موٹر کو کھانسی کا دورہ پڑتا ہے تو حمایت انجن کے منہ میں اسپرو کی دو گولیاں ڈال دیتا ہے۔ یہ موٹر حمایت کے سوائے کسی اور کے قابو میں نہیں آتی۔ اسے موٹر گیرج میں نہیں بلکہ

اصطبل میں رکھا جاتا ہے۔ حمایت اسے چلانے سے پہلے موٹر میں بیٹھنے والوں سے پوچھتا ہے:

"حضرات! کیا آپ لوگوں نے وصیتیں لکھ ڈالی ہیں اور کیا اپنی ماؤں سے دودھ بخشوالیا ہے؟"

اور جب اثبات میں جواب ملتا ہے تو وہ اچانک انجن کی پیٹھ پر ایک چابک رسید کرتا ہے اور موٹر ایک دولتی جھاڑ کر چل پڑتی ہے۔

اس موٹر کو چلانے میں صرف "جاکی" ہی حصہ نہیں لیتا بلکہ اس میں بیٹھنے والوں کو بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہنا پڑتا ہے۔ ایک صاحب کے ہاتھ میں بریکیں ہوتی ہیں، دوسرے صاحب کے ہاتھ میں ہارن ہوتا ہے، تیسرے صاحب کے ذمے یہ کام ہوتا ہے کہ وہ وقفے وقفے سے اس موٹر کے بار بار کھلنے والے دروازوں کو بند کرتے رہیں۔ "اجتماعی کاشت" کی طرح اس موٹر کی اجتماعی ڈرائیونگ ہوتی ہے۔

کرشن چندر اس گاڑی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور ہمارے اس سنگین مذاق پر غالباً دل میں خفا بھی ہوتے رہے اور یوں ہم ایشیا کے سب سے بڑے ادیب کو ایشیا کی سب سے گھٹیا موٹر میں بٹھا کر بخیر و خوبی اُردو ہال پہنچ گئے اور رٹز ہوٹل کے مالک کو خیریت سے پہنچنے کا ٹیلی گرام روانہ کر دیا۔

اُردو ہال میں کرشن چندر کے ساتھ ایک شام گزاری جانے والی تھی۔ اختر حسن اس محفل کے صدر تھے۔ ممتاز افسانہ نگار آمنہ ابوالحسن اس محفل میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری پر مقالہ پڑھنے والی تھیں۔ وہ محفل میں آئیں مگر اس دن ان کی طبیعت ناساز تھی۔ سو میں نے ان کا دلچسپ مقالہ پڑھ کر سنایا۔ پھر سلمیٰ آپا نے ایک خوبصورت افسانہ سنایا اور اس کے بعد کرشن چندر شروع ہو گئے۔ اس دن انھوں نے کوئی پانچ افسانے سنائے مگر پھر بھی سامعین کا جی نہیں بھرا۔ ابھی اختر حسن نے صدارتی تقریر

شروع نہیں کی تھی کہ ناصر کرنولی نے مجھے اطلاع دی کہ شفیقہ فرحت رات کی ٹرین سے واپس جارہی ہیں۔ میں اُٹھ کر باہر گیا۔ میں کانفرنس کے کاروبار میں اتنا اُلجھا ہوا تھا کہ شفیقہ فرحت سے تفصیلی بات چیت بھی نہ کرسکا۔ بس اجلاسوں میں "علیک سلیک" ہوتی رہی۔ کانفرنس کی بے پناہ مصروفیتوں نے مجھے بڑی حد تک بداخلاق بھی بنا دیا تھا۔ پھر شفیقہ فرحت روانہ ہوگئیں۔ میں واپس ہوا تو اس وقت تک اختر حسن کی صدارتی تقریر نے جذباتی موڑ اختیار کرلیا تھا۔ وہ اپنی تقریر میں اتنے جذباتی ہوگئے تھے کہ سارے ہال پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ ہر شخص ان کی تقریر کے سحر میں ڈوب چکا تھا۔ انھوں نے کرشن چندر کے بارے میں ایسی اثرانگیز باتیں کہیں کہ خود کرشن چندر بھی متاثر ہوگئے۔ اختر صاحب کی تقریر کا اثر تھا یا نہ جانے کیا کہ ہم مزاح نگاروں کے دل بھی مغموم ہوگئے۔

اب بچھڑنے کا وقت قریب آنے لگا تھا۔ قہقہوں کا کاروبار کرنے والوں کے دل بیٹھے جارہے تھے۔ ۱۸ مئی کو ناپلی اسٹیشن پر پھر ایک بار منتظمینِ کانفرنس جمع تھے مگر اس بار ان میں وہ ولولہ نہیں تھا جو ۱۳ مئی کو دیکھنے میں آیا تھا۔ ان کے چہرے اُترے ہوئے تھے، پژمردہ اور نڈھال۔ ان کے قہقہے نہ جانے کہاں دَب گئے تھے۔ اُنھیں یہ احساس ہونے لگا کہ زندگی میں انسان خوش رہنے کی لاکھ کوشش کرے مگر اسے قدم قدم پر رنجیدہ ہوجانا پڑتا ہے۔

کرشن چندر، سلمیٰ آپا، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا اور سرور جمال اب چند ہی لمحوں میں حیدرآباد کو خیرباد کہنے والے تھے۔ میں بہت اداس تھا اور اپنی بے وقوفی پر کفِ افسوس مل رہا تھا کیونکہ مزاح نگاروں کی کانفرنس نے جہاں اوروں کے لئے ہنسی کا سامان فراہم کیا تھا وہیں میرے لئے تڑپا دینے والی اور کبھی ختم نہ ہونے والی یادیں بخش دی تھیں۔

پھر ریل کی سیٹی بجی۔ کرشن چندر ڈبے میں سوار ہوگئے۔ سلمیٰ آپا اپنی نشست پر

بیٹھ گئیں۔ گاڑی چل پڑی اور کرشن چندر بڑی دُور تک ہاتھ ہلاتے رہے۔ منتظمینِ کانفرنس کے دل بہت بوجھل ہو گئے تھے۔ ہم سب چپ چاپ سر جھکائے پلیٹ فارم سے جانے لگے۔

اتنے میں اسٹیشن ماسٹر اچانک میرے پاس آیا۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں نظر آرہا تھا۔ اس نے آتے ہی مذاق میں مجھ سے پوچھا :

"کیوں صاحب! آج آپ کو نہیں چاہیے کیا ریلوے حادثہ ؟ کہیے تو ایک عدد ریلوے حادثہ کرادوں ۔"

اس پر میں نے نہایت غصہ سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر میں نے کہا : "مسٹر! زندگی میں ہمیشہ مذاق اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آدمی کو کبھی سنجیدہ بھی رہنا چاہیے ۔"

اور اسٹیشن ماسٹر حیرت سے صرف میرا منہ دیکھتا رہ گیا۔ وہ آج تک بھی یہ نہ جان سکا کہ اس دن اچانک مجھے کیا ہو گیا تھا ؟!

کتبۂ :- ولی الدین خوشنویس